پاکستان سے دیارِ حرم تک



نسیم حجازی

پاکستان سے دیارِ حرم تک



نسیم حجازی

جہانگیر بک ڈپو
• لاہور • راولپنڈی • ملتان • حیدرآباد • کراچی

ناشر: ریاض اے شیخ (ایڈووکیٹ)

آپ کے مشورے اور شکایات کے لئے۔
E-mail:info@jbdpress.com
www.jbdpress.com

اشاعت: 2005

سرورق: JBD آرٹ سیکشن، لاہور

قیمت: -/125 روپے



آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔ فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319
سیلز ڈپو: اردو بازار لاہور فون: 042-7220879، سیلز ڈپو: اردو بازار کراچی۔ فون: 021-2765086
سیلز ڈپو: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک، راولپنڈی۔ فون: 051-5552929
سیلز ڈپو: نزد دیو نیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ حیدرآباد۔ فون: 0300-3012131
سیلز ڈپو: اندرون بوہڑ گیٹ، ملتان۔ فون: 061-4781781
نیاز جہانگیر پرنٹرز، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور نے پرنٹ کی۔ فون: 042-7314319

پیش لفظ

یہ سفرنامہ روزنامہ کوہستان میں شائع ہو چکا ہے اور اب قارئین کے اصرار پر اسے چند اضافوں کے ساتھ کتاب کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔

میں گزشتہ دو سال سے "قیصر و کسریٰ" لکھنے کی تیاریاں کر رہا تھا ______ اس ناول کا پس منظر عرب، ایران اور روما کی تاریخ کا وہ دور ہے جب انسانیت جہالت اور گمراہی کی تاریکیوں میں دم توڑ رہی تھی اور حق کے متلاشیوں کی نگاہیں مکہ کی جانب ایک نئی صبح کے آثار دیکھ رہی تھیں۔

اس ضخیم کتاب کے لیے تاریخی مواد جمع کرنے کے بعد میری سب سے بڑی خواہش یہی ہو سکتی تھی کہ میں قلم اٹھانے سے پہلے وہ مقامات بھی دیکھ آؤں جو اس داستان کے تاریخی پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔ کم از کم حجاز کے قدرتی مناظر دیکھنے کے لیے مجھے وہاں جانا ضروری محسوس ہوتا تھا، لیکن یہ صرف مصنف کی خواہش ہی نہ تھی ______ میں بھی ان کروڑوں انسانوں میں سے ایک ہوں، جو ہر دعا کے ساتھ مکہ اور مدینہ جانے کی خواہش موجود پاتے ہیں۔

سفر کی روداد قلم بند کرتے وقت مجھے اس بات کا ہمیشہ احساس رہا کہ میں قارئین کی معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں کر سکوں گا۔ بالخصوص حرمین الشریفین کے سفر کے حالات بیان کرتے وقت میں بار بار یہ سوچتا تھا کہ اطرافِ عالم سے ہر سال لاکھوں انسان وہاں جاتے ہیں اور واپس آکر کروڑوں انسانوں کے سامنے اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں اور ان میں سے کئی ایسے بھی ہیں، جو مجھ سے زیادہ دیکھنے اور جاننے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ پھر میرے انتہائی مختصر سفر کی روداد کیا اہمیت رکھتی ہے ______؟

لیکن جب "کوہستان" میں مضامین کا سلسلہ شروع ہُوا تو قارئین کے خطوط سے میں نے یہ محسوس کیا کہ دیارِ حبیبؐ کی داستان سُننے اور سُنانے والوں کو ہمیشہ تشنگی محسوس ہوتی رہے گی ——— مجھے خط لکھنے والوں میں سے کئی حضرات ایسے بھی تھے جو مُتعدد بار دیارِ پاکؐ میں حاضری دے چکے ہیں اور جن کے مشاہدات مُجھ سے کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن جس ذوق و شوق کے ساتھ میں اُن کی سیاحت کے حالات سُنا کرتا تھا، اُسی ذوق و شوق کے ساتھ وہ میری رُوداد پڑھتے تھے اور یہ اُنہی حضرات کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ یہ سفرنامہ کتاب کی صُورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پاکستان سے روانہ ہونے وقت مجھے ایک عزیز دوست سید محمد جعفری مرحوم نے تاکید کی تھی کہ تمھیں مدینہ منورہ پہنچ کر اپنے تاثرات ضرور قلم بند کرنے چاہییں ——— اور میں نے انھیں یہ جواب دیا تھا کہ میں الفاظ کہاں سے لاؤں گا ——— ؟ اور میں اب بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ رُوداد لکھتے وقت میں اپنے احساسات کی ایک بالائی سطح سے نیچے نہیں جا سکا ———

یہ سفر ایک حسین خواب تھا، جس کی لذت محسوس کی جا سکتی ہے، بیان نہیں کی جا سکتی ———

میں یہ سفرنامہ لکھنے کی نیت سے وہاں نہیں گیا تھا اور نہ ہی سفر کے دوران اس مقصد سے کوئی تفصیلی نوٹ لینے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اس لیے میں نے زیادہ تر اپنی یادداشت پر بھروسہ کیا ہے اور ممکن ہے کہ نادانستہ مجھ سے کوئی فروگزاشت بھی ہو گئی ہو۔

میں نے صرف یہ چند مضامین لکھنے کی نیت سے قلم اُٹھایا تھا، مگر اب یہ محسوس کرتا ہوں کہ کاش یہ داستان اس قدر مختصر نہ ہوتی!

ایبٹ آباد
۱۰ اکتوبر ۱۹۶۰ء

نسیم حجازی

(۱)

آغازِ سفر

ایران، ترکی اور حجاز کا یہ سفر میرے نزدیک ماضی کے اُن گنت خوابوں کی تعبیر تھا۔ اس سے قبل ۱۹۵۱ء میں مصر، شام اور عراق کی سیاحت کے بعد اپنے دل پر یہ بوجھ لے کر واپس آیا تھا کہ میں حجازِ مقدس کی زیارت سے محروم رہا۔ آج سے تقریباً تین ماہ قبل اپنی نئی تصنیف "قیصر و کسریٰ" کی ابتدا کرتے ہوئے میں نے بڑی شدت کے ساتھ اُس بے آب و گیاہ وادی کو دیکھنے کی خواہش کی تھی، جس پر چودہ صدیاں قبل رحمتوں کی بارش ہوئی تھی۔ میں یثرب کے اُن نخلستانوں کو دیکھنا چاہتا تھا، جسے آج سکونِ قلب کے کروڑوں متلاشی اپنی آخری منزل سمجھتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں وہاں ضرور جاؤں گا۔ کب جاؤں گا اور کیسے جاؤں گا؟ ان سوالات کا جواب اُس حاکمِ مُطلق پر چھوڑ دیا تھا جس کی بارگاہ سے سپنوں کو تعبیریں ادا ہوتی ہیں۔ پھر اکتوبر کے آخری ہفتے مجھے صدرِ مملکت کے دورہ کے سلسلے میں ایران جانے کی دعوت موصول ہوئی تو میں اپنے احباب بالخصوص مسٹر عنایت اللہ کے اصرار پر سفر کی تیاری کے باوجود بڑی حد تک متذبذب تھا، لیکن اس کے بعد جب یہ اطلاع

آئی کہ صدرِ پاکستان شاید تہران کے بعد انقرہ تشریف لے جائیں، تو میرے ذہن میں سب سے پہلے جو خیال آیا، وہ یہ تھا کہ مجھے قدرت کی جانب سے تہران اور انقرہ کے راستے بارگاہِ مصطفوی میں حاضر ہونے کا اذن مل چکا ہے۔ اس کے بعد جب میں ۴ نومبر کو گھر سے روانہ ہُوا، تو تمام راستے یہ احساس غالب رہا کہ میرا ہر قدم مکہ اور مدینہ کی طرف اُٹھ رہا ہے۔

مجھے کراچی سے محکمۂ اطلاعات کے متعلقہ افسر کی یہ ہدایت موصول ہو چکی تھی کہ مجھے لاہور سے زرِ مبادلہ حاصل کرنے اور اپنے پاسپورٹ کی تجدید کرانے کے بعد ۸ نومبر تک کراچی پہنچ جانا چاہیے۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ مجھے باقی صحافیوں کے ہمراہ صدرِ پاکستان کی آمد سے قبل تہران پہنچنے کے لیے صرف پی۔آئی۔اے کا ایک طیارہ مل سکتا تھا جو ۹ نومبر کی صبح کو کراچی سے روانہ ہونا تھا۔ لہٰذا ۸ نومبر کو کراچی سے ایران کا ویزا حاصل کرنے کے لیے وہاں میری حاضری ضروری تھی۔ چنانچہ میں ۴ نومبر کی شام کو لاہور پہنچ گیا۔ دوسرے دن یعنی ۵ نومبر کو لاہور میں پاسپورٹ کی تجدید اور ایران اور ترکی کے لیے فارن ایکسچینج کے حصول کے مراحل بخیر و خوبی طے ہو گئے، لیکن جب حجازِ مقدس کی زیارت اور عمرہ کے لیے زرِ مبادلہ کے حصول کا مرحلہ آیا تو مجھے یہ بتایا گیا کہ آپ کی یہ درخواست منظور کی جاتی ہے، لیکن قاعدہ یہ ہے کہ پہلے آپ سعودی عرب میں داخلہ کے لیے وہاں کے سفارت خانے سے ویزا حاصل کریں۔

چنانچہ میں شام کے وقت پی۔آئی۔اے کے طیارہ سے کراچی روانہ ہُوا۔

وہاں پہنچ کر میں اس تصور سے پریشان تھا کہ کل جمعہ ہے اور مجھے بعض دفاتر میں نصف دن کی چھٹی کے باعث انتہائی محدود وقت میں بہت

سا کام کرنا ہے۔ چنانچہ رات کو بستر پر لیٹے ہُوئے میں گھنٹوں اور منٹوں کے حساب سے اپنا پروگرام بناتا رہا۔ مجھے فارن ایکسچینج کے متعلق زیادہ پریشانی نہ تھی، کیونکہ مجھے ایران اور ترکی کے لیے ایک سو پونڈ لاہور سے مل چکے تھے اور میں واپسی پر حجاز کی سیاحت کی خاطر بخل کی حد تک کفایت شعاری کرنے کے لیے تیار تھا۔ میرے اطمینان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے لیے مجھے تمام رقم پاکستانی کرنسی میں ادا کرنا تھی، لیکن جدہ کے راستے واپسی کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے سعودی عرب کا ویزا حاصل کرنا بہرحال ضروری تھا۔ ایک اندیشہ جس نے مجھے سب سے زیادہ پریشان کیا، یہ تھا کہ اگر سعودی عرب کا سفارت خانہ جمعہ کے روز پورے دن کی چھٹی کرتا ہو تو ویزا کیونکر حاصل ہو سکے گا؟

مسٹر رفیق اختر جو کراچی میں "کوہستان" کی نمائندگی کرتے ہیں، صبح ہوتے ہی میرے پاس پہنچ گئے اور ہم نے سب سے پہلے ٹیلیفون کر کے سعودی عرب کے سفارت خانے سے یہ پتہ کیا کہ جمعہ کے روز ویزا کے لیے آپ کا دفتر کھلتا ہے یا نہیں۔ جواب ملا کہ دفتر ضرور کھلے گا، لیکن متعلقہ افسر اب تک تشریف نہیں لائے۔

"کب تشریف لائیں گے؟"

"بس کوئی ایک گھنٹے کے بعد فون کر کے پوچھ لیجیے۔"

ہم بھاگتے ہُوئے محکمۂ اطلاعات کے دفتر میں حاضر ہوئے، لیکن وہ دفتر میں موجود نہ تھے۔ آدھ گھنٹہ بعد وہ تشریف لے آئے اور میں نے اُن کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا۔ اُنھوں نے سعودی عرب کے پاسپورٹ آفیسر کو ٹیلیفون کیا تو کسی کلرک نے جواب دیا کہ وہ ابھی تک تشریف نہیں لائے۔ پھر کوئی آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ پاسپورٹ آفیسر صاحب تشریف لے

آئے ہیں، لیکن ابھی تک سفیر صاحب تشریف نہیں لائے اور ان کی منظوری کے بغیر ویزا نہیں مل سکتا۔ رفیق اختر نے مجھے مشورہ دیا کہ ہم سعودی عرب کے سفارت خانے کا رُخ کرنے سے پہلے نیشنل گرینڈلیز بنک سے پتہ کرلیں کہ فارن ایکسچینج کس وقت تک مل سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نیشنل گرینڈلیز بنک پہنچے۔ میری اپنی گھڑی عام طور پر پیچھے رہا کرتی ہے، لیکن آج اس کی سُوئیاں بڑی تیزی سے بھاگ رہی تھیں میں سیدھا منیجر کے کمرے میں پہنچا اور ان کے سامنے سعودی عرب کے فارن ایکسچینج کی وہ درخواست رکھ دی، جو لاہور میں منظور ہوئی تھی، اور ساتھ ہی ان سے یہ پوچھا کہ آپ کا بنک کب تک کھُلا رہے گا۔ یہ منیجر صاحب انگریز تھے۔ اُنھوں نے سر سے پاؤں تک میری جانب دیکھا اور کہا کہ یہ بنک کوئی ڈیڑھ گھنٹہ اور کھُلا رہے گا، لیکن پچاس پونڈ کے سفری چیک حاصل کرنے میں آپ کو زیادہ دیر نہیں لگے گی اور اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے گھنٹی بجا کر ایک بابو کو بلا لیا۔ میں نے کہا "یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ اس کام کے لیے مجھے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے، لیکن اس مقصد کے لیے سعودی عرب کے ویزا کی ضرورت ہے اور ویزا اس وقت ملے گا جب سفیر صاحب اپنے دفتر تشریف لائیں گے اور مجھے اندیشہ ہے کہ جب وہ دفتر تشریف لائیں گے تو آپ کا بنک بند ہو چکا ہوگا اور اگر آپ چاہیں تو میرا یہ اندیشہ رفع کر سکتے ہیں۔" انھوں نے کہا "تو پھر آپ کل تشریف لے آئیں۔" میں نے جواب دیا "اگر میں کل حاضر ہو سکتا تو اس وقت آپ کو پریشان نہ کرتا۔ کل اس وقت میں تہران پہنچ چکا ہوں گا۔" وہ صاحب دوبارہ مسکرائے "تو بہت اچھا میں آپ کا انتظار کروں گا۔" اتنی دیر میں وہ بابو صاحب جنھیں اُنھوں نے بلایا تھا، میرے کاغذات کا بغور مطالعہ کر چکے تھے، اُنھوں نے فی الفور اعتراض کر دیا کہ لاہور

سٹیٹ بنک کے جس افسر نے آپ کو زرِ مبادلہ کی منظوری دی ہے، اس کے دستخطوں کا کوئی ریکارڈ ہمارے دفتر میں موجود نہیں ہے۔ اس لیے ان دستخطوں کی تصدیق کے لیے آپ کو کراچی سٹیٹ بنک جانا پڑے گا۔ ایک ثانیہ کے لیے میرے مُنہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر میں نے انگریز منیجر کی طرف دیکھا اور کہا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحب نے میری پریشانی اور آپ کے انتظار کی مدت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔" اور انھیں جواب کا موقع دیئے بغیر باہر چلا آیا اور ٹیکسی پر سٹیٹ بنک پہنچ گیا۔ وہاں کئی آدمی کھڑکیوں کے سامنے کھڑے تھے۔ کام کرنے والوں کو سر اُٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ "خدایا! میری باری کب آئے گی؟" گھڑی کی طرف دیکھنا میں نے ترک کر دیا تھا۔ کوئی بیس منٹ یا آدھ گھنٹہ کے بعد یہ مرحلہ طے ہوا۔ وہاں سے ٹیکسی دوڑاتے ہوئے سعودی عرب کے سفارت خانے پہنچے۔ ویزا افسر نے ہمیں جلد ہی اندر بلا لیا اور انتہائی مروت کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد مجھے درخواست کے فارم پُر کرنے کے لیے دے دیئے اور جب میں نے فارم پُر کر کے اُن کے سامنے رکھ دیئے تو اُنھوں نے کہا "آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا، ابھی سفیر صاحب نیچے نہیں اُترے۔" کوئی آدھ گھنٹہ گزر گیا اور اس دوران ویزا افسر نے کافی سے میری تواضع کی۔ یہ صاحب بہت متواضع تھے، لیکن سچ پوچھیے تو میں اس کافی کو اس طرح پی رہا تھا جیسے ملیریا کا مریض اپنے معالج کے اصرار پر کونین مکسچر پی رہا ہو۔ پھر ایک ملازم اچانک یہ خبر لایا کہ سفیر صاحب دفتر میں تشریف لے آئے ہیں۔ میں کئی بار یہ فقرہ دُہرا چکا تھا کہ صاحب مجھے بہت دیر ہو رہی ہے۔ پاسپورٹ افسر اُٹھ کر اندر گئے اور تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے مجھے ویزا عنایت کر دیا۔ میں نے شکریہ ادا

کر کے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے کہا "نہیں صاحب تشریف رکھیے! سفیر صاحب آپ کو ایک خط دے رہے ہیں۔" اور میں یہ سمجھا کہ شاید یہ خط بھی ویزا کے ساتھ ضروری ہو۔ دل پر ایک پہاڑ کا بوجھ لے کر بیٹھ گیا۔ انھوں نے دوبارہ کافی منگوائی۔ میں نے معذرت کی، لیکن انھوں نے اصرار کیا اور مجھے اُن کی مہمان نوازی کا احترام کرنا پڑا۔ چند منٹ بعد مجھے اپنے دل میں ایک نئی کیفیت کا احساس ہونے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ویزا تو مل چکا ہے، اب میں پاکستانی روپے سے پورے سفر کا ٹکٹ تو حاصل کر سکتا ہوں۔ اگر سعودی عرب کے لیے زرِ مبادلہ نہ ملا تو میں ایران اور ترکی میں کفایت شعاری سے کام لے کر کچھ بچا سکوں گا۔ رفیق اختر صاحب میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے پاسپورٹ افسر سے کہا "جناب! انھیں ابھی بنک جانا ہے وہ خط کیسا ہے؟" انھوں نے کہا کہ سفیر صاحب اپنی طرف سے ایک تعارفی خط دے رہے ہیں تاکہ سعودی عرب میں سفر کرتے ہوئے ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔" میں اچانک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ان سے کہا "جناب! میں اس خط کے لیے بے حد ممنون ہوں، لیکن ابھی مجھے بنک جانا ہے جو شاید بند ہو چکا ہو اور ایران کا ویزا حاصل کرنے کے لیے ایران کے سفارت خانے میں پہنچنا ہے، آپ خط دفتر کے کسی ملازم کو دے دیں، میں وہاں سے فارغ ہو کر لے جاؤں گا۔" انھوں نے کہا "پھر آپ کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں، میں سینٹرل ہوٹل کے فلاں کمرہ میں مقیم ہوں، آپ جب بھی وہاں آئیں گے، آپ کو یہ خط مل جائے گا۔" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور مسٹر رفیق اختر کے ساتھ بنک کی طرف چل پڑا۔ بنک کے منیجر حسبِ وعدہ میرا انتظار کر رہے تھے اور انھوں نے یہ جتانے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ تم

بہت دیر سے آئے ہو۔ بنک سے سعودی عرب کا زرِ مبادلہ لینے کے بعد ایرانی سفارت خانے میں پہنچا۔ وہاں سے ایران کا ویزا حاصل کرنے کے بعد مجھے گلوب ایجنسی میں اپنا ٹکٹ خریدنے کے لیے جانا تھا، لیکن یہاں ایک اور مرحلہ پیش آیا اور وہ یہ تھا کہ ٹکٹ کے لیے کچھ رقم میرے پاس تھی اور باقی راولپنڈی سے میری روانگی سے قبل بذریعہ ٹیلیگرافک ٹرانسفر کراچی کے بنک کو بھجوائی جا چکی تھی، لیکن رفیق اختر صاحب صبح سے مختلف اوقات میں اس بنک کو ٹیلیفون کر چکے تھے اور وہاں سے یہ جواب آیا تھا کہ راولپنڈی سے کوئی اطلاع ابھی تک ہمارے پاس نہیں پہنچی۔ گلوب ایجنسی کے منیجر کو میری پریشانی کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے کسی حیل و حجت کے بغیر چیک لینا قبول کر لیا۔ جب ہم ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر ہوٹل کا رُخ کر رہے تھے تو رفیق اختر نے کہا کہ مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ تمام مراحل آج ہی طے ہو جائیں گے، اور میرے مُنہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے "طے کیوں نہ ہوتے میرے بھائی! مجھے میرے آقا نے بُلایا ہے۔" پھر میں نے اپنے جسم میں ایک کپکپی محسوس کی اور میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔

۷ نومبر کی صبح کو ۸ بجے کے قریب میں پی۔ آئی۔ اے کے طیارہ پر تہران کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ کچھ راستہ بائیں ہاتھ سمندر اور دائیں ہاتھ خشک سیاہی مائل پہاڑوں کا سلسلہ دکھائی دیتا رہا۔ پھر سمندر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور دونوں اطراف پہاڑوں، وادیوں اور صحراؤں کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آنے لگا۔ اس علاقے کے بیشتر خدوخال بلوچستان سے ملتے تھے۔ بہت کم مقامات ایسے تھے جہاں انسانی آبادی کے آثار دکھائی دیتے تھے۔

کوئی چار گھنٹے کی پرواز کے بعد ہمیں ایک وسیع آبادی کے آثار

دکھائی دیئے اور پائلٹ نے اعلان کیا کہ ہم تہران پہنچنے والے ہیں۔ چند منٹ بعد پی۔ آئی۔ اے کا طیارہ مہرآباد کے ہوائی اڈے پر اُترا۔

ہوائی جہاز سے باہر نکلتے ہی سرد اور خشک ہوا کے جھونکوں نے ہمارا استقبال کیا اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ میں نومبر کے مہینے کوئٹہ کی وادی میں پہنچ گیا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تہران کا رُخ کر رہا تھا۔

(۲)

تہران

کوہِ البرز کے دامن میں تہران صرف ایران کا سب سے بڑا شہر ہی نہیں، بلکہ دُنیا کے چند جدید، پُررونق اور خوب صورت شہروں میں سے ایک ہے۔ اُس کی پہلی جھلک دیکھنے کے بعد یہ بات ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے کہ یہ مشرق کے کسی پس ماندہ مُلک کا دارالحکومت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اٹھارہ یا بیس لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں کم و بیش ایک لاکھ کاریں ہیں۔ سڑکیں کافی کُشادہ ہیں، لیکن کاروں کے ہجوم کے سامنے تنگ معلوم ہوتی ہیں۔ ہر سڑک کے دونوں کنارے ایستادہ کاروں سے پُر رہتے ہیں اور وسط میں دو رویہ ٹریفک اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ ایک اجنبی کے لیے سڑک عبور کرنا ایک انتہائی خطرناک مسئلہ بن جاتا ہے۔

ایران کے ڈرائیور عام طور پر بہت تیز چلنا پسند کرتے ہیں اور ٹریفک جس قدر زیادہ ہو، اُسی قدر اُن کا یہ شوق فراواں ہوتا ہے۔ اس قسم کے مناظر اکثر دیکھنے میں آتے ہیں کہ سڑک پر تیز رفتار کاروں کے نہ ختم ہونے والے قافلے دائیں اور بائیں بھاگ رہے ہیں، پھر اچانک کنارے کی ایستادہ کاروں میں سے

ایک کار باہر نکلتی ہے اور آن کی آن میں سڑک عبور کر کے دوسرے کنارے بھاگتی ہوئی کاروں کے قافلے میں شامل ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی طرح دوسرے کنارے پر کسی گلی سے ایک اور کار "اناولاغیری" کا نعرہ لگاتی ہوئی نمودار ہوتی ہے، ایک ثانیے کے لیے ٹریفک کا نظام برہم ہو جاتا ہے اور متوقع حادثات کے تصور سے آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن نہ ٹریفک رکتی ہے اور نہ کوئی حادثہ پیش آتا ہے۔ مختلف سمتوں سے ایک دوسرے کی زد میں آنے والی کاریں دائیں بائیں کتراتی ایک دوسرے کو مس کرتی ہوئی اور جیومیٹری کے تمام فارمولوں کا مذاق اڑاتی ہوئی بخیر و عافیت گزر جاتی ہیں۔

اس قسم کے واقعات ان چوراہوں پر بھی دیکھنے میں آتے ہیں جہاں ٹریفک کا سپاہی کھڑا ہوتا ہے۔ ٹریفک کے سپاہی کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ کاروں کے تیز رفتار قافلے کسی وجہ سے رکنے نہ پائیں۔ اگر کوئی سر پھرا قاعدے کی خلاف ورزی کر کے خود بچتا اور دوسروں کو بچاتا ہوا نکل جائے تو سپاہی سیٹی بجانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، بلکہ بعض اوقات غیر شعوری طور پر اس کا ہاتھ بھی اسی سمت گھوم جاتا ہے۔

ایران میں رہ کر تیز رفتار کاروں کے ہجوم میں سڑک عبور کرنے کا جو طریقہ ہم نے معلوم کیا وہ یہ تھا کہ جب کاروں کی قطار میں تھوڑی سی جگہ خالی نظر آئے، تو چند قدم چل کر رک جائیں، ایک ثانیہ کھڑے رہیں، پھر چند قدم چل کر رک جائیں اسی طرح تین چار بار چلنے اور رکنے کے بعد دوسرے کنارے پہنچ جائیں گے کاریں آئیں گی اور آپ سے کتراتی ہوئی گزر جائیں گی اور آپ کا بال تک بیکا نہ ہوگا۔

آپ شاید یہ سمجھیں کہ ایسی حالت میں سڑک عبور کرتے ہوئے انسان

ایک سہمے ہوئے ہرن کی طرح چاروں طرف دیکھتا ہوا گزرے گا۔ یہ بات نوواردوں کے متعلق تو صحیح ہو سکتی ہے لیکن جہاں تک تہران کے باشندوں کا تعلق ہے وہ اسی اطمینان سے سڑک عبور کرتے ہیں، جیسے کوئی اپنے گھر کے صحن کے اندر ٹہل رہا ہو۔ ہمارے یہاں پیدل چلنے والے کار سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہاں کار پیدل چلنے والے سے بچنے کی کوشش کرتی ہے۔

تہران میں ہمارا قیام تقریباً ڈیڑھ ہفتہ رہا، لیکن اس عرصہ میں ہم نے کار کے تصادم کا کوئی حادثہ نہیں دیکھا۔ صرف ایک دن جب کہ ہم تہران سے باہر ایک پہاڑی ندی کے مناظر دیکھنے کے لیے گئے تھے تو شہر سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر دو کاریں دکھائی دیں، جن کے اگلے حصے ایک دوسرے کے اندر دھنسے ہوئے تھے، لیکن اس غیر آباد مقام پر ٹریفک کی کثرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہم نے پاکستانی سفارت خانہ کے قریب ٹورسٹ ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے نیوز ایڈیٹر مولانا محمد سعید میرے ساتھ تھے اور ہمیں جو کمرہ ملا، اس کے دریچے کوہ البرز کی جانب کھلتے تھے۔ تہران کی بیشتر دلکشی و رعنائی کوہ البرز کی رہین منت ہے۔ صاف شفاف اور میٹھے پانی کی وہ ندیاں جن سے تہران کے باغات اور خوبصورت سڑکوں پر اگے ہوئے درخت سیراب ہوتے ہیں، اسی پہاڑ سے آتی ہیں۔ ہوا میں صحت بخش خنکی بھی اسی پہاڑ کے باعث ہے جس کی بدولت تہران کے باشندے انتہائی تندرست توانا اور سرخ و سفید دکھائی دیتے ہیں۔

صدر پاکستان ۹ نومبر کو تہران تشریف لانے والے تھے اور

۸ نومبر کا دن ہمارے لیے مکمل فراغت کا دن تھا۔ پاکستان کے پریس آتاشی خواجہ عبدالحمید عرفانی نے شمران کے دلکش مناظر کی تعریف کی اور ہم اگلے دن شمران کی سیر کو چل پڑے۔ شمران کی خوبصورت آبادی شہر سے چند میل دُور قدرے بُلندی پر واقع ہے۔ اس طرف جانے والی کشادہ سڑک چنار کے دورویہ گنجان درختوں میں سے گزرتی ہے۔ اس سڑک کے کناروں پر خوبصورت مکانات اور سرسبز باغات ہیں۔ موسمِ خزاں کی آمد کے باوجود کوہِ البرز کی سنگلاخ چٹانوں کے پس منظر میں زمین کا یہ سرسبز و شاداب ٹکڑا ایک نہایت دلکش خطہ معلوم ہوتا تھا اور ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ گرمیوں کے موسم میں جب قدرت چنار کے درختوں کو نیا لباس عطا کرتی ہے، یہ تدریجی نشیب کس قدر دلکش معلوم ہوتا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ گرمیوں کے موسم میں شمران اور تہران کے درجۂ حرارت میں دس ڈگری کا فرق ہوتا ہے اور اس خوبصورت سڑک پر کاروں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

شام کے وقت خواجہ عبدالحمید عرفانی مجھے "کیہان" کے دفتر میں لے گئے۔ "کیہان" ایران کا دوسرا بڑا اخبار ہے اور فارسی کے علاوہ اس کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہوتا ہے۔ یہ اخبار ابن وقت سے پاکستان کا حامی چلا آرہا ہے، جب کہ ہمیں بیرونی ممالک میں دوستوں کی تلاش تھی اور بہت کم اخبارات بھارت کے مقابلہ میں پاکستان کی ہمنوائی کے لیے آمادہ تھے۔ "کیہان" کے مالک نے اپنے سٹاف سے میرا تعارف کرایا۔ پاکستان کے انقلاب سے متعلق چند سوالات پوچھے اور پھر مجھے اپنا پریس دکھانے کے لیے لے گئے۔ یہاں تین پاکستانی نوجوانوں سے میرا تعارف کرایا گیا جو پریس میں ٹائپسٹ تھے اور نہایت معقول تنخواہیں پاتے تھے۔

۹ نومبر کو صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں تشریف لانے والے

تھے۔ مہرآباد کے ہوائی اڈے سے لے کر ہز رائل ہائینس شہزادہ عبدالرضا پہلوی کے محل تک جہاں صدرِ پاکستان کو قیام فرمانا تھا، تمام سڑکیں آراستہ کی گئی تھیں، ہوائی اڈہ ایران اور پاکستان کے جھنڈوں سے سجایا گیا تھا۔ ایران کے وزرا اور اعلیٰ سول اور فوجی حکام، پاکستان کے سفیر اور ان کے عملہ کے ارکان ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ تہران کے پاکستانی باشندے بھی وہاں ایک قطار میں کھڑے تھے۔ صدرِ پاکستان کی آمد سے قبل شہنشاہِ ایران بھی ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ دس بجے صدرِ پاکستان کا طیارہ جسے ایران کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد شاہی فضائیہ کے لڑاکا طیاروں کے ایک دستہ کی حفاظت میں لایا گیا تھا، مہرآباد کے ہوائی اڈے پر اُترا اور تھوڑی دیر بعد اس جگہ پہنچ گیا، جہاں صدرِ پاکستان کے استقبال کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جونہی فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اپنے فوجی لباس میں نمودار ہوئے، اعلیٰ حضرت شہنشاہِ ایران نے آگے بڑھ کر اُن کا خیر مقدم کیا۔ صدرِ پاکستان نے شاہِ ایران سے اپنے رفقا کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد شہنشاہِ ایران نے صدرِ پاکستان سے اپنے وزرا اور اراکینِ سلطنت کا تعارف کرایا۔ پھر صدرِ پاکستان اور شہنشاہِ ایران سُرخ قالین پر چلتے ہوئے اس پلیٹ فارم پر پہنچے، جہاں دونوں ممالک کے پرچم لہرا رہے تھے۔ شاہی بینڈ نے ایران اور پاکستان کے قومی ترانے گائے۔ ساتھ ہی اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔ صدرِ پاکستان نے گارڈ آف آنر کا معاینہ کیا۔ اس کے بعد وہ ان لوگوں کی طرف بڑھے جو ہوائی اڈے کے دروازے تک قطار باندھے کھڑے تھے۔ شہنشاہِ ایران ان کے ساتھ تھے۔ صدرِ پاکستان نے ہر شخص کے ساتھ باری باری مصافحہ کیا، اور شہنشاہ نے بھی اُن کی تقلید کی۔ سینکڑوں آدمیوں کے ساتھ ہاتھ ملانے کے بعد یہ دونوں سربراہ ایک کار میں بیٹھ گئے۔ موٹر سائیکلوں کا ایک دستہ

اور امپیریل گارڈز کی چار خاص کاریں اُن کے آگے چل پڑیں اور باقی کاروں کا ایک طویل قافلہ ان کے پیچھے ہو لیا۔ اب تہران کے عوام کا جوش و خروش قابلِ دید تھا۔ ہزاروں مرد اور عورتیں، بچے اور بوڑھے سڑک کے دونوں کناروں پر معزز مہمان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کھڑے تھے۔ تہران میں صدرِ پاکستان کی مصروفیات کی تفصیلات اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں اور یہاں انھیں دہرانا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی شخصیت تہران کے ہر مجمع اور محفل میں نمایاں نظر آتی تھی۔ ان کی شکل و صورت، قد و قامت، چال ڈھال اور ان کا اندازِ گفتگو وہاں کے عوام و خواص کی دلچسپی کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ تہران کے بچے اور بوڑھے اُن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے چشم براہ تھے۔ تہران کا پریس ان کے متعلق ہر خبر کو نمایاں جگہ دیتا تھا۔ اہلِ ایران کی جانب سے یہ ایک دوست ملک کے سربراہ کا رسمی استقبال نہ تھا، بلکہ اس میں وہ جذباتی شیفتگی بدرجۂ اتم موجود تھی جو دل کی گہرائیوں سے اُٹھتی ہے۔ شہنشاہ ایران تقریباً ہر پروگرام میں صدرِ پاکستان کے ساتھ شریک تھے اور انھیں ایک دوسرے کے ساتھ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایران اور پاکستان کے درمیان اجنبیت کی کوئی دیوار حائل نہیں ہے۔

اپنی رونق، صفائی اور ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے مشرق کا کوئی شہر تہران کا ہم پلہ نہ ہوگا۔ اگر لباس سے کسی کی اقتصادی حالت کا اندازہ لگایا جائے تو یہاں امیر اور غریب کے درمیان تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ عام لوگ اچھا کھانے اور پہننے کے عادی ہیں۔ ضروریاتِ زندگی پاکستان کے مقابلے میں دو گنا اور بعض اوقات تین گنا زیادہ گراں ہیں۔ اسی نسبت سے مزدوری بھی زیادہ ہے۔ پاکستان میں اگر قمیص کی سلائی دو رُوپے ہے، تو وہاں تقریباً اسی قدر

ایک قمیص کی دُھلائی ادا کرنی پڑتی ہے، اور یہ مبالغہ نہیں۔ میں دو قمیصیں اور دو شلواریں دُھلانے کی غلطی کر بیٹھا، جس کے لیے مجھے پاکستانی سکہ کے حساب سے تقریباً آٹھ روپے ادا کرنے پڑے۔ ہمارے ہوٹل کے پڑوس کے ایک سیلون میں شیو کرانے کی فیس تقریباً دو رُوپے تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود تہران کے ننانوے فیصد باشندوں کے چہروں پر خوشحالی نظر آتی ہے۔ ایسی خوش حالی جس کا ایران کے بیشتر علاقوں کو دیکھتے ہوئے تصور نہیں کیا جا سکتا۔

جمعہ کے روز تہران کے باشندے مکمل چھٹی مناتے ہیں۔ دُکانیں اور بازار مکمل طور پر بند ہوتے ہیں اور سڑکوں پر کاروں کے ہجوم میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ گرمیوں کے دنوں میں یہ لوگ شہر سے کئی کئی میل دُور جا کر پکنک کرتے ہیں۔ اقتصادی اعتبار سے اہلِ تہران اور ایران کی بیشتر آبادی کے درمیان وہی بُعد ہے جو ایک پیادہ اور کار سوار کے درمیان ہوتا ہے، اور اس بُعد کو وہاں کے بعض دُور اندیش بُری طرح محسوس کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ فارغ البال طبقہ بھی اِس صورتِ حال سے پریشان نظر آتا ہے، جو اس سے قبل لباس کی تبدیلی یا تہران کو مشرق کا پیرس بنا دینے کو ہی بڑا کمال سمجھتا تھا۔ پڑھے لکھے نوجوان جن کے ساتھ مجھے تبادلۂ خیال کا موقع ملا، پاکستان کی موجودہ حکومت کی زرعی اصلاحات سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے تھے۔ ایک اخبار نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ ہمیں پاکستان سے سبق لینا چاہیے اور شہنشاہِ ایران کو بذاتِ خود اس قسم کے تعمیری انقلاب کی رہنمائی کرنی چاہیے۔

۱۱ر نومبر کی صبح کو مجھے چند گھنٹوں کی فرصت ملی اور میں مولانا سعید اور مسٹر حمید نسیم کے ساتھ تہران سے کرج کی جانب روانہ ہوا۔ یہ ایک ندی ہے، جو کوہ البرز سے نکلتی ہے اور جس پر بند لگا کر تہران کو پانی مہیا کیا جاتا ہے۔ اس ندی کے کنارے

کریج نامی قصبہ آباد ہے۔ تہران سے کار پر کوئی نصف گھنٹہ کی مسافت پر ہم اس ندی کے کنارے سفر کر رہے تھے۔ ندی کے دونوں طرف خشک چٹانیں تھیں بلوچستان کے کوہِ مُردار اور چہلتن کی یاد دلاتی تھیں۔ ندی کے کناروں پر چنار اور سفیدے کے گھنے درخت تھے۔ قریباً ایک گھنٹہ کے بعد ہم اس ندی کے بند کے قریب پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ سردیوں میں یہاں سیر کرنے والوں کی زیادہ آمدورفت نہیں ہوتی، لیکن گرمیوں میں تہران کے ہزاروں باشندے یہاں چھٹی کا دن گزارتے ہیں۔

(۱۲)

مشہدِ مُقدّس

تین دن کے انتہائی مصروف پروگرام کے بعد فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اور ان کے رفقاء ۱۲ نومبر کو مشہدِ مقدس کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے۔ صدر پاکستان سے کچھ دیر قبل وہاں پہنچنے کے لیے ہم علی الصبح شاہی فضائیہ کے ایک ڈکوٹے پر روانہ ہو گئے۔ مہر آباد کے ہوائی اڈے سے پرواز کرتے ہی ہمیں اپنے بائیں ہاتھ دماوند کی برفانی چوٹی دکھائی دی جس کا بالائی حصہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہ کوہِ البرز کی بلند ترین چوٹی ہے اور مجھے اس کی بلندی کا احساس اس وقت ہوا، جبکہ پینتالیس منٹ پرواز کرنے کے بعد بھی وہ میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ میں نے جاپان کے پہاڑ فیوجی جاما کی جو تصویریں دیکھی ہیں، وہ دماوند کے ساتھ غایت درجہ کی مشابہت رکھتی ہیں۔ تہران سے مشہد تک تقریباً تمام راستہ پہاڑی معلوم ہوتا تھا۔ خشک چٹانوں کے دامن میں کہیں کہیں کسی سبزہ زار یا بستی کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ بعض بلند پہاڑیوں کی چوٹیوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ تقریباً تین گھنٹے کی پرواز کے بعد اچانک چند بلند چوٹیاں عبور کرتے ہی ہمیں ایک کشادہ وادی میں مشہد کا خوبصورت

شہر دکھائی دیا۔ ہوائی اڈے پر پہنچ کر ہمیں کچھ دیر صدر پاکستان کی آمد کا انتظار کرنا پڑا۔

مشہد، ایران کے صوبہ خراسان کا دارالحکومت ہے۔ وہاں کے گورنر جنرل، عہدہ دار، امرا اور معززینِ شہر، صدرِ پاکستان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ہوائی اڈے کی عمارت کے سامنے بیش قیمت قالین بچھے ہوئے تھے اور اردگرد پاکستان و ایران کے پرچم لہرا رہے تھے۔ ہوا تہران سے زیادہ سرد محسوس ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد صدر پاکستان کی پارٹی کے چند ارکان ڈکوٹا سے پہنچ گئے۔ ازاں بعد شہنشاہ ایران کا خاص طیارہ جس پر صدرِ پاکستان سوار تھے، دکھائی دیا۔ پھر چند منٹ بعد صدر اور شہنشاہ ایران طیارے سے اترے۔ فوجی بینڈ نے ایران اور پاکستان کے قومی ترانے گائے۔ صدر کو سلامی دی۔ پھر صدرِ پاکستان اور شہنشاہِ ایران کو جلوس میں بیسیوں کاروں کا ایک طویل قافلہ مشہد کی طرف روانہ ہوا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر عورتوں اور مردوں کے بے پناہ ہجوم کھڑے تھے۔ ان کے سیدھے سادے لباس، جن پر مشرقیت غالب تھی، دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم مغرب سے نکل کر مشرق میں آ گئے ہیں۔

صدرِ پاکستان اور شہنشاہِ ایران کا جلوس حضرت امام رضاؑ کے روضۂ اقدس کے سامنے رکا اور وہ کار سے اتر کر اس شاندار عمارت کے اندر داخل ہوئے جسے ایران کے فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ روضہ ایران کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے اور ہر سال دور دراز کے ممالک سے بھی ہزاروں زائرین یہاں آتے ہیں۔ امام رضاؑ کی وفات سے قبل یہ شہر ایک چھوٹی سی بستی تھی، لیکن امام رضاؑ کے روضۂ اقدس کے باعث یہ بستی ایک

قصبہ بن گئی۔ پھر جب میراں شاہ نے پڑوس کا شہر طوس تباہ و برباد کر دیا تو مشہدِ مقدس کو خراسان میں ایک مرکزی اہمیت حاصل ہو گئی۔ ایران کا ہر حکمران اس روضے سے ملحقہ عمارت میں کوئی نہ کوئی اضافہ کرتا چلا آیا ہے۔ بالخصوص بارہویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک کے حکمرانوں نے اس کی زیبائش و آرائش میں بہت زیادہ دلچسپی لی ہے۔ تیمور کے بیٹے شاہ رُخ اور صفوی خاندان کے حکمرانوں بالخصوص شاہ طہماسپ اوّل اور شاہ عباس اوّل نے اس روضے کی دلکشی و رعنائی میں اضافہ کرنے میں بہت زیادہ دلچسپی لی ہے۔ روضے کی محرابوں اور گنبد کے اندر شیشے سے جو نقش آرائی کی گئی ہے، وہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ روضے سے ملحق لائبریری اور میوزیم میں متعدد فنی و تاریخی نوادرات، قیمتی مسودات، نادر کتب، قرآن حکیم کے قدیم نسخے اور فنِ خطاطی کے بہترین نمونے جمع کر دیے گئے ہیں۔ امام رضاؑ کے روضہ کے بالکل ساتھ ایرانی فنِ تعمیر کا شاندار نمونہ وہ خوبصورت مسجد ہے جسے ۱۴۱۸ء میں شاہ رُخ کی ملکہ گوہر شاد نے تعمیر کیا تھا۔ طوس جہاں ایران کے مشہور شاعر فردوسی کا مزار ہے، مشہد کے شمال مشرق میں کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

مشہد میں ہمارا قیام چند گھنٹوں سے زیادہ نہ تھا۔ سہ پہر کے وقت ہم ہوائی جہاز پر سوار ہو کر بلند پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک خوبصورت وادی میں مشہدِ مقدس کے گنبدوں اور میناروں کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے۔ غروبِ آفتاب کے کچھ دیر بعد ہم تہران پہنچ گئے۔

تہران پہنچتے ہی فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے پاکستانی سفارت خانے میں تہران میں مقیم پاکستانی باشندوں سے ملاقات کی۔ اس اجتماع میں پاکستان

کا ماضی، حال اور مُستقبل موضوعِ بحث تھا۔ صدرِ پاکستان انتہائی خندہ پیشانی سے ہر سوال کا جواب دے رہے تھے۔ اپنے سربراہ سے چند دُور افتادہ پاکستانیوں کی یہ رسمی ملاقات نہ تھی۔ وہ ایک ایسے پاکستانی سے ہمکلام تھے جو انھیں یہ اطمینان دلانے کی پوزیشن میں تھا کہ اب تمہارا ملک محفوظ ہے۔

(۴)

اصفہان نصف جہان

پاکستان سے روانہ ہوتے وقت میرے ایک دوست نے بار بار مجھ سے یہ تاکید کی تھی کہ اگر موقع ملے تو اصفہان ضرور دیکھنا۔ صرف وہاں جا کر تم جان سکو گے کہ ایران کیا ہے۔ اصفہان کی پہلی جھلک دیکھنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ اُن کی یہ بات کتنی صحیح تھی۔

قُدرت نے ایران کو مجموعی طور پر جن نعمتوں سے نوازا ہے ان میں سے بیشتر اصفہان کے حصے میں آئی ہیں۔ یہ حسین شہر سطحِ سمندر سے تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک وسیع میدان میں واقع ہے۔ اس کے گرد و نواح کی زرخیز زمین مغرب اور جنوب کی سمت پہاڑوں سے نکلنے والی ندیوں سے سیراب ہوتی ہے۔ ان پہاڑوں کی بعض چوٹیاں چودہ ہزار فٹ تک بلند ہیں اور موسمِ سرما کی برف باری کے طفیل ان ندیوں کو کافی پانی ملتا ہے جو نشیب کے میدانوں کو سیراب کرتی ہیں۔ اصفہان کا مشہور دریا "زندہ رود" بھی انہی پہاڑوں سے نکلتا ہے۔

اپنی تاریخ اور اپنی عظیم الشان عمارات کے باعث اصفہان کو

ایران میں وہی خصوصیت حاصل ہے جو پاکستان میں شہر لاہور کو ہے۔ اس کی تاریخ دو ہزار سال سے زیادہ پرانی ہے۔ مسلمانوں نے اس کو ۶۴۲ء میں فتح کیا تھا اور اس کے قریباً ایک ہزار سال تک عرب، مغول، ترک، افغان اور ایرانی حکمرانوں نے اپنے اپنے ادوار میں اس شہر پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں، لیکن ایران کے دوسرے بڑے شہروں کے مقابلے میں اس کی ترقی اور شہرت کا زمانہ ۱۵۱۱ء عیسوی میں صفوی خاندان کے دورِ حکومت کے ساتھ شروع ہوتا ہے، جنھوں نے اسے اپنا دارالحکومت بنا کر تمام ایران کو اپنے جھنڈے تلے متحد و منظم کر لیا تھا۔ صفوی خاندان کے جن حکمرانوں نے اس شہر کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا تھا، ان میں شاہ عباس کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس شہر کی سینکڑوں عمارتیں قابلِ دید ہیں، لیکن چند گھنٹوں کے قیام کے دوران ہمارے لیے اس عظیم شہر کی دلکشی و رعنائی کا جائزہ لینا ممکن نہ تھا۔ صفوی خاندان کے دورِ حکومت کی مشہور ترین عمارات اس خوب صورت میدان میں واقع ہیں، جہاں کسی زمانے میں چوگان کھیلا جاتا تھا۔ یہاں وہ سات منزلہ بُرج واقع ہے جس کے اُوپر شاہ عباس اپنے رفقا اور مہمانوں کی معیت میں بیٹھ کر پولو دیکھا کرتے تھے۔ یہ بُرج ۴۸ میٹر اُونچا ہے اور اس کی چھت پر پہنچ کر چاروں اطراف اصفہان کے دل کش منظر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور یہ شہر بے شمار گنبدوں اور میناروں کا ایک طلسم کدہ معلوم ہوتا ہے۔ اصفہان بلکہ میرے خیال میں پورے ایران کی حسین ترین عمارت "مسجد شاہ" ہے، اس میدان کے جنوب میں واقع ہے، یہ عظیم اور دلفریب عمارت، جسے دل کی طرح دیکھا تو جا سکتا ہے، لیکن بیان نہیں کیا جا سکتا، شاہ عباس

نے ۱۶۱۲ء سے ۱۶۳۰ء تک کے درمیانی عرصے میں تعمیر کرائی تھی اور تقریباً یہی وہ زمانہ تھا جب مغلوں کے ہاتھوں ہندوستان کی عظیم ترین عمارات تعمیر ہو رہی تھیں۔ مسجد کے اندر جو سنگِ مرمر استعمال کیا گیا ہے، وہ کوئی سو میل دُور اَزدستان سے لایا گیا تھا۔ دروازوں، گنبدوں اور میناروں پر روغنی سلوں کے نقش و نگار دیکھ کر یہ گمان نہیں ہوتا کہ اس پر تین صدیاں گزر چکی ہیں اور پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہاں بارش کے علاوہ برف بھی گرتی ہے تو یہ بات اور زیادہ تعجب خیز ہوتی ہے۔ اندرونی دیواروں اور چھتوں کی سلوں کے نقش و نگار بھی ایرانی آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔

مسجد کے احاطے کا طول و عرض ۱۴۶ اور ۱۳۰ میٹر ہے۔ دروازے کے مینار ۴۸ میٹر بلند ہیں اور بڑے گنبد کا کلس فرش سے ۵۲ میٹر بلند ہے۔ بڑے گنبد کے دونوں اطراف سردالوں میں نماز کے لیے دو اور بڑے ہال ہیں۔ مسجد شاہ کی عظمت، دلکشی اور رعنائی کا ہلکا سا تصور بھی پیش کرنے کے لیے چند سطور یا چند صفحات کافی نہیں۔ میں اگر صرف اس کے دروازے کا ذکر کروں تو بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ بجائے خود دنیا کی شاندار عمارات میں سے ایک ہے۔ "مسجد شاہ" کے قریب ہی ایک اور مسجد ہے جو "لطف اللہ مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ "مسجد شاہ" کے مقابلے میں یہ مسجد بہت چھوٹی ہے اور اس کے گنبد کے ساتھ مینارے بھی نہیں ہیں، لیکن اس کے اندر داخل ہونے کے بعد روغنی سلوں کے نقش و نگار صفوی دور کے آرٹ کا ایک اور دلکش نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد اصفہان کی خواتین کے نماز پڑھنے کے لیے بنائی گئی تھی۔

صفوی دور کی ایک دلچسپ عمارت "چہل ستون" ہے۔ یہ شاہی باغ

کے اندر وسیع اور خوب صورت سائبان ہے، جو بیس ستونوں پر کھڑا ہے لیکن اسے چہل ستون اس لیے کہا جاتا ہے کہ پاس ہی تالاب میں ان ستونوں کا عکس نظر آتا ہے۔ گویا بیس ستون اور ان کے بیس عکس مل کر چالیس ستون بن جاتے ہیں۔ اس سائبان کے نیچے صفوی حکمران گرمیوں کے موسم میں عیش و نشاط کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ اصفہان کی قدیم عمارات میں سے جامع مسجد خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ بعض روایات کے مطابق اس مسجد کی بنیاد سات سو عیسوی میں ایران کے ایک قدیم آتشکدہ کے کھنڈروں پر رکھی گئی تھی۔ اور دوسری روایات کے مطابق اسے دو سو چھبیس ہجری یا نویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد خلیفہ معتصم عباسی کے دور میں اسے از سرِ نو تعمیر کروایا گیا تھا۔ ۱۰۵۰ء میں یہ مسجد شکستہ حالت میں تھی اور ۱۰۵۷ء میں اس کی مرمت کی گئی تھی۔ اس کے بعد ترک، مغول اور ایرانی حکمران یکے بعد دیگرے اس مسجد میں اپنے ذوقِ تعمیر کی یادگاریں چھوڑتے رہے۔ یہاں پر اصفہان کے بعض افغان فرمانرواؤں کے کتبے بھی موجود ہیں۔

اصفہان کے ہوائی اڈے کی طرف سے شہر میں داخل ہوتے ہوئے جو چیز سب سے پہلے ایک نووارد کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے وہ "زندہ رود کے پل" ہیں۔ یہ پل دور سے بلند عمارتیں معلوم ہوتے ہیں اور ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے معماروں کے ذہن میں گزرگاہوں سے زیادہ سیرگاہیں تعمیر کرنے کا جذبہ کارفرما تھا۔ اصفہان کا مشہور پل جسے "خواجو" کہتے ہیں، شاہ عباس نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کی لمبائی ۱۱۰ اور چوڑائی ۱۴ میٹر ہے۔ اس کی چھبیس محرابیں اور اوپر تلے چار منزلیں تعمیر کی گئی ہیں اور اس کے دونوں جانب اکاون کمرے ہیں۔

اپنی تاریخ اور قدیم روایات کے ساتھ ساتھ اصفہان ہر لحاظ سے ایک جدید شہر بھی ہے۔ یہاں سولہ کارخانے ہیں جن میں دس ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔ یہاں کے مختلف فنون و علوم کے مدارس میں تقریباً پچاس ہزار طلبہ، جن میں سولہ ہزار لڑکیاں ہیں، تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اصفہان کی قدیم صنعتیں بالخصوص قالین بافی اور میناکاری کی صنعتیں آج بھی ترقی پر ہیں اور اس مقصد کے لیے وہاں ایسے مراکز موجود ہیں جہاں لوگوں کو ان کی تربیت دی جاتی ہے۔ اصفہان کے تقریباً ایک لاکھ جفاکش باشندے بالواسطہ یا بلاواسطہ پارچہ بافی، قالین بافی، صناعی، میناکاری، نجاری اور مصوری میں قابلِ تعریف مہارت کی بدولت عزت اور فراغت کی روٹی کماتے ہیں اور پانچ اور دس لاکھ کے درمیان آبادی کے اس شہر میں ایک متوسط درجہ کی جو فراغت اور خوشحالی نظر آتی ہے، وہ شاید ایران کے کسی اور شہر میں نہ ہوگی۔ اہلِ مشہد کی طرح یہاں کے باشندوں کا رجحان بھی مغرب سے زیادہ مشرق کی طرف ہے۔ صدرِ پاکستان کے استقبال میں بھی ان لوگوں نے بے پناہ جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ چند گھنٹے اصفہان کی سیاحت کے بعد ہم ہوائی جہاز پر شیراز کا رخ کر رہے تھے اور میں میناروں اور گنبدوں کے اس شہر کو الوداع کہتے وقت محسوس کر رہا تھا کہ کاش میں کچھ دیر یہاں اور ٹھہر سکتا! اور میں نے سنا ہے کہ جو لوگ یہاں دنوں کی بجائے ہفتوں اور مہینوں ٹھہرتے ہیں، وہ بھی رخصت ہوتے وقت یہی شکایت کرتے ہیں کہ انھیں اس خوب صورت شہر کو جی بھر کر دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

(۵)

حافظ اور سعدی کا شیراز

اصفہان سے تقریباً ایک گھنٹہ پرواز کے بعد ہم شیراز پہنچ گئے۔ کوئی ڈیڑھ لاکھ آبادی کا یہ شہر ایران کے صوبہ فارس کا صدر مقام ہے۔ فارس یا پارس درحقیقت آرین قوم کے اس گروہ کا نام تھا جس نے تقریباً گیارھویں صدی قبل مسیح میں وسطِ ایشیا سے ہجرت کر کے ایران کے سرسبز و شاداب خطے میں سکونت اختیار کی تھی۔ شیراز کی سرسبز و شاداب وادی سطح سمندر سے تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ تاہم جنوب کی طرف سمندر سے قریب ہونے کے باعث اس کی آب و ہوا شمالی ایران کے شہروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ معتدل اور خوشگوار ہے۔ اصفہان کی طرح اس شہر کے ماضی کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے۔ ساسانیوں کے زمانے سے لے کر خاندان پہلوی کے دورِ اقتدار تک یہ شہر زمانے کے کئی انقلابات دیکھ چکا ہے۔ کئی اولوالعزم فاتحین کے قافلے اس کے قرب و جوار کی وادیوں سے گزر چکے ہیں، لیکن اگر اس شہر کے ماضی کی تاریخ بادشاہوں، گورنروں اور فاتحین کے تذکروں سے بالکل خالی ہوتی تو بھی صرف سعدی و حافظ کے نام اسے زندۂ جاوید بنا دینے کے

لیے کافی تھے۔ شیراز شاید مشرق و مغرب کے ان فاتحین کا کوئی مدِمقابل پیش کر سکے، جو تلوار کی نوک سے اپنے راستے صاف کرتے ہوئے فارس کے خیابانوں تک پہنچ جاتے تھے، لیکن سعدی و حافظ نے اپنے قلم کی نوک سے شیراز کے لیے جو فتوحات حاصل کی تھیں، ان کے آگے تیمور جیسے کشورکشاؤں کا جاہ و جلال ماند پڑ جاتا ہے۔

حضرت سعدی علیہ الرحمۃ جن کی "گلستاں" اور "بوستاں" پر صرف ایران ہی نہیں، بلکہ پورا عالمِ اسلام فخر کر سکتا ہے، ۱۱۸۴ء میں شیراز میں پیدا ہوئے تھے۔ اس شاعر، سیاح اور مبلغ نے اپنی زندگی کے بیشتر ایام عالمِ اسلام کی سیاحت میں صرف کیے تھے۔ آج ہوائی جہاز کے زمانے میں بھی حج ایک کارنامہ سمجھا جاتا ہے، لیکن حضرت سعدی کی شیفتگی اور ان کے عشق و محبت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنی زندگی میں چودہ مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کی۔ اقلیمِ سخن کے اس تاجدار نے اطرافِ عالم میں اپنی عظمت کے جو پرچم صدیوں قبل نصب کیے تھے، آج بھی اسی شان و شوکت کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ شام کے وقت جب میں ان کی لحد کے قریب کھڑا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ عالمِ بالا میں اس محبِ رسولؐ کی رُوح قدسیوں کے ہجوم میں یہ نعت گا رہی ہے:

بلغ العلےٰ بکمالہٖ
کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ
صلّوا علیہ وآلہٖ

صدرِ پاکستان کے ساتھ عقیدت و محبت کے مظاہرے ہیں

زندہ دلانِ شیراز'' اصفہان و مشہد کے عوام سے کچھ آگے ہی تھے۔ ہوائی اڈے سے لے کر شہر تک کئی میل کے فاصلے پر، پوری سڑک کے دونوں کناروں پر ان کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ شہر کے خوش پوش باشندوں کے علاوہ ان لوگوں میں ہمیں ان دیہاتیوں کے گروہ بھی نظر آئے، جنھیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم بلوچستان کے کسی علاقے میں پہنچ گئے ہیں، صدر پاکستان شام کے قریب شاہ چراغ کے مزار پر گئے۔ اس مزار کے ساتھ ایک رفیع الشان مسجد بھی ہے۔ اس کے بعد وہ شیخ سعدیؒ علیہ الرحمۃ اور حافظؒ کے مزارات پر گئے۔ شہنشاہ ایران حسبِ معمول اس سارے پروگرام میں ان کے ساتھ تھے۔

رات کے وقت صدر پاکستان کے اعزاز میں شیراز کے گورنر کی طرف سے ایک پُرتکلف دعوت دی گئی اور ہمارا ۱۵ر نومبر کا پروگرام ختم ہوا ——

اگلی صبح ہم فارس کے ایک قدیم شہر پرسی پولس (تختِ جمشید) کے کھنڈر دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے۔ صدر اور شہنشاہِ ایران کے پیچھے کاروں کا ایک طویل قافلہ تھا۔ پرسی پوس، جس کے کھنڈر آج بھی دارائے اعظم کے دربار کی شان و شوکت کی گواہی دیتے ہیں، شیراز سے چالیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے، یہ شہر ۳۳۰ قبل مسیح میں سکندرِ اعظم کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا۔ شکستہ دیواروں اور ٹوٹے ہوئے ستونوں کے نقش و نگار ان جابر شہنشاہوں کی آخری یادگار ہیں، جنھیں دُور دراز کے بیسیوں ممالک خراج ادا کرتے تھے۔ یہ کھنڈر ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہیں اور ان کے سامنے میلوں تک ایک طویل و عریض وادی ہے، جسے دیکھ کر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس شہر کا قرب و جوار بھی کسی زمانے میں شیراز کی طرح سرسبز و شاداب رہا ہوگا، لیکن یونانیوں کے ہاتھوں ایران کے اس عظیم شہر کی تباہی اس قدر مکمل تھی کہ اس کے بعد کسی

حکمران کو اس کے دوبارہ آباد کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا، آج جب ایرانی ماضی کے آغوش میں اپنی عظمتِ رفتہ کے نشان تلاش کرتے ہیں تو اسلامی دور سے آگے ان کی نگاہیں پرسی پوس کے کھنڈروں پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہیں۔

تہران میں مجھے بتایا گیا کہ چند سال بعد اس شہر کی پچیس سو سالہ سالگرہ منائی جائے گی اور ابھی سے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اس کی تیاریاں ہو رہی ہیں، دوپہر کے قریب ہم پرسی پوس سے واپس شیراز پہنچ گئے اور وہاں کھانا کھانے کے بعد بذریعہ ہوائی جہاز تہران روانہ ہو گئے۔ ۱۷ر نومبر ایران میں ہمارے قیام کا آخری دن تھا اور ہم نے اپنا بیشتر وقت سفر کی تیاریوں میں گزارا۔ ۱۸ر نومبر کو صدر پاکستان کی روانگی سے تقریباً دو گھنٹے قبل سبینہ ایرآئیز کا طیارہ انقرہ کی طرف پرواز کرنے والا تھا اور پاکستانی سفارت خانے کے ایک افسر مسٹر صدیقی نے اس طیارے پر ہماری سیٹیں ریزرو کرانے کا کام اپنے ذمے لے رکھا تھا۔

ایران کی سیاحت کی یہ داستان شاید پاکستان کے پریس اور کلچرل اتاشی خواجہ عبدالحمید عرفانی کے تذکرے کے بغیر مکمل نہ ہو۔ گزشتہ چند سال سے میں ان کی کارگزاری کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا، لیکن مجھے ان کی خدمات کا صحیح احساس ایران کی سیاحت کے بعد ہوا۔

آپ ایران کے کسی شہر میں چلے جائیں وہاں عرفانی صاحب کے جاننے والے ضرور ملیں گے۔ فارسی شعر و ادب کے ساتھ دلچسپی رکھنے والے ایرانیوں کے کتب خانوں میں ان کی کتابیں ضرور موجود ہوں گی۔ ایک مبلغ کی حیثیت سے عرفانی صاحب کا مقصد ایران میں اقبالؒ کو، اور اقبالؒ کی وساطت سے پاکستان کو متعارف کروانا تھا اور اس مقصد میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔ ایران

کے جو شاعر، دانشور اور ادیب پاکستان کے حریفوں کے معاندانہ پروپیگنڈے سے متاثر تھے، وہ اب اقبال کے پاکستان کو اپنا دوسرا وطن سمجھتے ہیں۔ پاکستان اور ایران کے درمیان صدیوں کے روحانی رشتے دوبارہ زندہ کرنے کے لیے ذہانت، خلوص اور تڑپ کی ضرورت تھی اور خواجہ عرفانی ان تمام نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ ایران کے عظیم شاعر مرحوم بہار بھی کسی زمانہ میں ان لوگوں میں سے تھے، جو پاکستان کے خلاف بھارتی پروپیگنڈہ سے متاثر تھے، لیکن عرفانی صاحب سے متعارف ہونے کے بعد جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ پاکستان عالمِ اسلام کے عظیم ترین مفکر کے سپنے کی تعبیر ہے تو وہ ایران میں پاکستان کے سب سے بڑے حامی بن گئے۔ آج یہ حالت ہے کہ ایران میں اقبالؒ اور بہار کے متعلق خواجہ عرفانی کی تصانیف "ادبی جواہر پارے" سمجھ کر پڑھی جاتی ہیں اگر ایران اور پاکستان کے درمیان اقبالؒ کا فکر ایک پُل کا کام دے سکتا ہے تو اُس پُل کی جانب ایرانیوں کو متوجہ کرنے کا سہرا عرفانی صاحب کے سر ہے۔ ایران اور پاکستان کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے کے لیے خواجہ صاحب ایک سرکاری ملازم کے احساسِ ذمہ داری سے کہیں زیادہ ایک مبلغ کے جوش اور ولولہ کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

تہران میں صدرِ پاکستان کے قیام کے ایام میں وہ بیحد مصروف تھے، لیکن جب کبھی انھیں دفتری کام سے فرصت ملتی تھی تو وہ میرے کمرے میں پاؤں رکھتے ہی یہ کہتے تھے کہ چلو آج فلاں ادیب یا صحافی سے مل آئیں۔ اور میں ان کے ساتھ چل پڑتا تھا۔ کبھی کبھی یوں ہوتا تھا کہ راستے میں کوئی ادیب صاحب دکھائی دیتے ہیں اور خواجہ صاحب ڈرائیور کو کار روکنے کا حکم دے کر فرماتے ہیں "بھائی نسیم! اُترو پہلے ان سے مل لیں۔"

میں پوچھتا ہوں "یہ کون صاحب ہیں؟"

"بھئی یہ فلاں ہیں!"

"لیکن خواجہ صاحب! آپ تو مجھے فلاں صاحب کے یہاں لے جا رہے تھے۔"

"بھئی، یہ اُن سے زیادہ اہم ہیں۔ میں اتنے دنوں سے ان کی تلاش میں تھا، اب یہ اتفاق سے مل گئے ہیں اور میں ان سے چند منٹ گفتگو کا موقع کھونا مناسب نہیں سمجھتا۔" خواجہ صاحب انھیں آواز دیتے ہیں اور وہ مدت کے ایک بچھڑے ہوئے دوست کی طرح خواجہ صاحب سے بغلگیر ہو جاتے ہیں۔ میرا تعارف کرایا جاتا ہے۔ گفتگو کی ابتدا شاعری یا ادب سے ہوتی ہے اس کے بعد ایران اور پاکستان کے اہم ترین مسائل زیرِ بحث آ جاتے ہیں اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر کسی مقصد کے ساتھ شیفتگی ہو تو ایک پریس اتاشی بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔

۱۸ نومبر کو طلوعِ آفتاب کے وقت میں ہوائی جہاز کی کھڑکی سے تہران کی آخری جھلک دیکھ رہا تھا۔ کوہِ البرز کی وہ چوٹیاں جنھیں میں نے پہلے دن برہنہ دیکھا تھا، اب برف کا لبادہ اوڑھ چکی تھیں۔ کچھ دیر ہوائی جہاز کی کھڑکی سے باہر جھانکنے کے بعد میں نے اپنے تھیلے سے ایک کتاب نکالی، لیکن چند صفحے پڑھنے کے بعد میری طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ میرے خیالات تہران، اصفہان اور شیراز کی جانب مبذول ہو چکے تھے۔ میں ایران کے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس ماضی کے متعلق جس کے ساتھ صدیوں سے ہمارے تہذیبی، روحانی اور جذباتی رشتے قائم تھے۔ اس حال کے متعلق جس نے ہمیں ان رشتوں کو از سرِ نو زندہ کرنے پر مجبور کر دیا

ہے اور اس مستقبل کے متعلق جس کی طرف ہم کبھی نئی امنگوں، نئے حوصلوں اور کبھی کرب و اضطراب کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ماضی کا ایران مشرق کا ایران تھا، حال کا ایران نیم مشرقی ہے اور نیم مغربی! اور میں اس سوال کا جواب سوچ رہا تھا کہ مستقبل کا ایران کیا ہوگا؟

اس سوال کا جواب پرسی پولس کے کھنڈر دے سکتے ہیں نہ تہران کی وہ عمارات، جنھیں دیکھ کر پیرس، لندن اور واشنگٹن یاد آجاتے ہیں۔ میں اس سوال کا صحیح جواب مادرِ ایران کے ان فرزندوں پر چھوڑتا ہوں، جنھیں زمانے کے حالات بتدریج یہ سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ اہلِ ایران کو شاہراہِ حیات کا ایک متحرک قافلہ بنانے کے لیے اس کی مشرقیت اور مغربیت کے درمیان ایک وسیع خلا کو پاٹنے کی اشد ضرورت ہے۔ آج کسی ملک کے استحکام کے لیے یہ کافی نہیں کہ اس کے چند شہروں میں مغرب کی ظاہری دلکشی و رعنائی کے بیشتر اسباب جمع کر دیے جائیں یا اس کی ایک محدود اقلیت کا معیارِ زندگی یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں کے برابر کر دیا جائے، بلکہ اس کے لیے ایک ایسے صحت مند معاشرے کی ضرورت ہے، جو مثبت نظریات اور پائدار اخلاقی و روحانی بنیادوں پر قائم ہو، جو ملک کے وسائل کو پوری قوم کی خوشحالی اور فلاح و ترقی کے لیے استعمال کرنے کی طاقت و قدرت رکھتا ہو۔ ایران میں ایک ایسے صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لیے اخلاقی و روحانی بنیادیں پہلے سے موجود ہیں، جو نظریات کی کش مکش کے اس دور میں انسانیت کو امن و خوشحالی کا پیام دے سکتی ہیں۔

ایران کے حال اور مستقبل کا سب سے بڑا خطرہ اشتراکی جارحیت ہے، لیکن جہاں تک اندرونی حالات کا تعلق ہے، ایران نے ان تخریبی عناصر

پر پوری طرح قابو پالیا ہے، جو کمیونزم کی یلغار کے لیے چند برس قبل ہراول دستے کا کام دے رہے تھے۔ اگرچہ ایران میں ابھی اجتماعی خوشحالی کا وہ دور پوری طرح شروع نہیں ہوا جسے اشتراکی جارحیت کے خلاف کسی ملک کے تحفظ کی بہترین ضمانت قرار دیا جا سکتا ہے، تاہم موجودہ حکومت کے اصلاحی اور تعمیری منصوبوں نے ایران کے مستقبل کے لیے کافی امید افزا حالات پیدا کر دیے ہیں۔

مجھے جن ایرانیوں سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا، وہ عراق کی صورتِ حال سے کافی پریشان تھے۔ وہ یہ اندیشہ ظاہر کرتے تھے کہ عراق بتدریج اشتراکی جارحیت کی اگلی چوکی بنتا جا رہا ہے۔ کمیونسٹ ہر صورت میں قاسم سے اپنے تعاون کی قیمت وصول کریں گے اور ان کی اولین کوشش یہی ہوگی کہ عراق اپنے ہمسایہ ممالک سے اس قدر الجھ جائے کہ قاسم کے لیے روس کے اشاروں پر ناچنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ اگر قاسم نے شط العرب کا جھگڑا کھڑا کر کے ایران کی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ عراق مکمل طور پر روس کا دست نگر ہو کر رہ جائے اور ایران کو اچانک ایک خطرۂ عظیم کا سامنا کرنا پڑے۔

اہلِ ایران طبعاً امن پسند ہیں۔ وہ اپنے ہمسایہ کے معاملے میں مداخلت پسند نہیں کرتے، وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے کہ ان کے ہمسائے بھی پُرامن رہیں، لیکن بدقسمتی سے ایران کے بعض ہمسائے ایسے ہیں، جن کا سیاسی لغت امن، ہمسائگی اور رواداری کے الفاظ سے خالی ہے۔ افغانستان کی خارجہ پالیسی ایران کے لیے کافی پریشان کن ہے۔ کابل کے حکمران دریائے ہلمند کا رخ موڑ کر ایران کا ایک وسیع علاقہ بنجر بنانے کا منصوبہ بنا

چکے ہیں۔ ایران یہ مسئلہ بھی پُرامن گفت و شنید کے ذریعہ حل کرنے کا خواہشمند ہے، لیکن افغانستان میں روسیوں کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ شاید اس کی یہ نیک توقعات پوری نہ ہونے دے گا۔ عالمِ اسلام کا یہ کتنا بڑا سانحہ ہے کہ عراق اور افغانستان کے سیاست دان اس خطرۂ عظیم کو اپنی سرحدوں کے اندر لے آئے ہیں، جس کے تصور نے امریکہ جیسے عظیم ملک کو اپنی سرحدوں سے ہزاروں میل آگے دفاعی چوکیاں قائم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ آج ایرانیوں کے دل میں پاکستان کو سمجھنے اور اس کے قریب آنے کی خواہش موجزن ہے اور یہ خواہش کوئی نئی خواہش نہیں۔ ان کے ماضی کی تاریخ ہمارے اپنے ماضی کی تاریخ ہے اور ان کے حال اور مستقبل کو ہمارے حال اور مستقبل سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے جدید سیاسی تعلقات صدیوں کی تاریخی، تہذیبی اور رُوحانی بنیادوں پر استوار ہو رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ وہ نیک توقعات وابستہ کرنے میں حق بجانب ہیں جو ایک شریف ہمسایہ دوسرے شریف ہمسایہ سے وابستہ کر سکتا ہے اور یہ عجب نہیں کہ ایران اور پاکستان کی بے لوث دوستی ان اسلامی ممالک کے لیے بھی ایک نیا شعور بیدار کرنے کا ذریعہ بن جائے، جنھیں ان کے گم کردہ راہ لیڈر اسلام کی بین الاقوامی اخوت کے دائرے سے نکال کر اشتراکیت کی گود میں ڈال رہے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایرانی انتہا پسند اور جذباتی ہوتے ہیں اور ان کی یہ انتہا پسندی اور جذباتیت ان کے لیے کبھی کبھی خطرے کا باعث بن جاتی ہے، لیکن میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ ایرانی اپنی جذباتیت اور انتہا پسندی کے باوجود کسی خطرناک موڑ سے آگے نہیں جاتے، بالکل ان ڈرائیوروں کی طرح جن کی برق رفتاری دیکھنے والوں کو ہر آن کسی حادثے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے،

لیکن وہ اچانک اپنا رُخ بدلتے ہیں اور خطرات کے ہجوم سے پہلو بچاتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ اہلِ ایران ماضی میں کئی طوفانوں سے پہلو بچا کر نکلے ہیں اور ہمیں دُعا کرنی چاہیے کہ خُدا مستقبل میں بھی ہمارے ان قریب ترین ہمسایوں اور عزیز ترین دوستوں کا حامی و ناصر ہو!

ایران سے واپس آ کر چند ماہ بعد میں نے یہ امید افزا خبر سُنی کہ عبدالکریم قاسم نے ایران کے ساتھ شط العرب کے مسئلہ پر پُرامن گفت و شنید کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ خبر پورے اسلامی ممالک کے لیے ایک نیک فال ہے۔ پاکستان کے متعلق بھی عراق کی پالیسی میں ایک خوشگوار تبدیلی آ چکی ہے اور قاسم فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی دعوت پر پاکستان تشریف لا رہے ہیں۔ ان خبروں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ عراق کو اپنے ان اسلامی بھائیوں سے بدظن کرنے کے لیے کمیونسٹوں کی کوششیں ناکام ہو چکی ہیں، جن کے سینے اہلِ عراق کے لیے خیر سگالی کے جذبات سے لبریز ہیں۔ کشمیر کے مسئلہ میں عراق کی انقلابی حکومت نے پہلی بار کھُل کر پاکستان کی ہمنوائی کی ہے۔ ہمیں یہ دُعا کرنی چاہیے کہ ایران اور پاکستان کی طرف عبدالکریم قاسم کا جھکاؤ عراق کو باقی اسلامی ممالک سے قریب لانے کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

(۶)

انقرہ

تہران سے انقرہ کی طرف پرواز کرتے ہوئے میں نے جو مناظر دیکھے، وہ ایران کے مناظر سے ملتے جلتے تھے۔ پہاڑوں اور وادیوں کا ایک سلسلہ ختم ہوتا تھا تو دوسرا شروع ہو جاتا تھا۔ مجھے دائیں اُفق پر ایک برفانی چوٹی دکھائی دی جو راستے کے تمام پہاڑوں سے بلند معلوم ہوتی تھی اور چند منٹ بعد جہاز کے لاؤڈ سپیکر پر پائلٹ نے یہ اعلان کیا کہ یہ کوہِ ارارات ہے۔ علمائے تحقیق کے نزدیک یہ وہی پہاڑ ہے، جہاں سیلابِ عظیم کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا سفینہ ٹھہرا تھا۔ چند سال قبل اس پہاڑ پر برف میں دبی ہوئی کشتی بھی دریافت ہو چکی ہے، جس کے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ نوح علیہ السلام کی کشتی تھی۔ یہ بلند پہاڑ جسے اس کا تاریخی پس منظر ایک امتیازی شان عطا کرتا ہے مجھے دیر تک نظر آتا رہا۔

اب میں اس ملک کی فضا میں پرواز کر رہا تھا، جس کے ماضی کی تاریخ کو میں نے اپنے ماضی کی تاریخ سمجھ کر پڑھا تھا۔ میں ایک مُدت سے ترکی دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ ۱۹۵۱ء میں امریکہ اور یورپ کی سیاحت سے

واپسی پر میں یہاں چند دن رُکنا چاہتا تھا، لیکن قدرت کو اس وقت میرا یہاں آنا منظور نہ تھا۔ برسلز میں اچانک علالت کے باعث مجھے اپنا پروگرام تبدیل کرنا پڑا اور میں استنبول میں رُکنے کی بجائے سیدھا کراچی پہنچ گیا، اور اب آٹھ سال بعد میری زندگی کی ایک بہت بڑی خواہش پوری ہو رہی تھی اور میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میں آٹھ سال سے اپنے خیالوں اور سپنوں کی اس حسین منزل کی طرف سفر کر رہا ہوں ——— ہوائی جہاز انقرہ کے خوبصورت شہر پر پرواز کرتا ہُوا چند میل دُور ہوائی اڈے پر اُترا۔ ترکی کی سرزمین پر پہلی بار پاؤں رکھتے ہوئے میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی خاک کا ذرہ ذرہ غرور و افتخار کے ساتھ سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔

پروگرام کے مُطابق صدرِ پاکستان کی آمد میں ابھی کچھ وقت باقی تھا اور ہم ہوائی اڈے کے ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد ہوائی اڈے پر ایک طیارہ اُترا اور ہم اسے صدرِ پاکستان کا ہوائی جہاز سمجھ کر باہر نکل آئے، لیکن معلوم ہوا کہ یہ ٹرکش ایرلائنز کا طیارہ ہے جس پر ترکی کے وزیرِ اعظم عدنان مندریس جو ایک دن قبل ایک اہم کانفرنس کے سلسلے میں تہران گئے تھے تشریف لائے ہیں، ہمارا خیال تھا کہ صدرِ پاکستان اور ترکی کے وزیرِ اعظم ایک ساتھ یہاں پہنچیں گے، لیکن وزیرِ اعظم عدنان نے بذاتِ خود صدرِ پاکستان کا استقبال ضروری سمجھا اور کچھ دیر پہلے پہنچ گئے۔

انقرہ کی ہوا ایران کے ان تمام مقامات سے زیادہ سرد تھی، جو ہم نے دیکھے تھے ——— صدرِ پاکستان کے استقبال کے لیے ترکی کابینہ کے ممبران، اعلیٰ سول اور فوجی افسر ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ ترکی فوج کے چاق چوبند سپاہیوں کا ایک دستہ بھی وہاں کھڑا تھا۔ اچانک فضا میں پی۔ آئی۔ اے

کا طیارہ دکھائی دیا اور چند منٹ بعد صدرِ پاکستان اس جسور و غیور قوم کے رہنماؤں کے درمیان کھڑے تھے جس کی دوستی پر دُنیا کی ہر قوم فخر کر سکتی ہے۔ اپنے میزبانوں سے مصافحہ کرنے اور فوجی دستہ سے سلامی لینے کے بعد صدرِ پاکستان کاروں کے ایک جلوس کے ساتھ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے استقبال میں انقرہ کے عوام کا جوش و خروش قابلِ دید تھا۔ ہوائی اڈے سے شہر تک پندرہ بیس میل کے راستے میں دونوں اطراف لاکھوں انسان صفیں باندھے کھڑے تھے۔ سڑک پر جگہ جگہ دروازے بنے ہوئے تھے۔ بعض دروازوں پر ترکی کے رومن رسم الخط کی بجائے عربی رسم الخط میں "خوش آمدید مہمانِ عزیز" لکھا ہوا تھا۔

جگہ جگہ پاکستان اور ترکی کے قومی پرچم لہرا رہے تھے اور ان پر ہلال کا نشان ہمارے درمیان صدیوں پرانے ذہنی اور رُوحانی رشتے کی غمازی کر رہا تھا۔ جدید ترکی کا یہ دارالحکومت ہر لحاظ سے ایک ماڈرن شہر ہے۔ ترکی کا دارالحکومت بننے سے پہلے یہ مقام ان حریت پسندوں کا مستقر تھا جنھوں نے اتاترک مصطفےٰ کمال کی قیادت میں مغرب کی استعماری قوتوں کے خلاف اپنے وطن کی آزادی اور بقا کی جنگ لڑی تھی۔ اس شہر کے متعلق ترکوں کے جذبات وہی ہیں، جو واشنگٹن کے متعلق امریکنوں کے ہو سکتے ہیں۔ جس عقیدت اور محبت کے ساتھ امریکی عوام جارج واشنگٹن کے مزار پر جاتے ہیں، اسی عقیدت کے ساتھ ترک مصطفےٰ کمال کے مزار پر جاتے ہیں۔ تاہم اپنی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے انقرہ یا انگورہ کا نام نیا نہیں۔ بعض علمائے آثارِ قدیمہ کے خیال کے مطابق یہ شہر ولادتِ مسیحؑ سے صدیوں پہلے موجود تھا اور مختلف ادوار میں اناطولیہ کی سلطنت کا دارالحکومت رہ چکا ہے۔ سکندرِ اعظم کے زمانہ سے قبل

یہ شہر ایرانیوں کے قبضے میں تھا۔ رومیوں نے سنہ ۱۸۹ قبل مسیحؑ میں اس شہر پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے بعد سنہ ۶۲۰ء میں ایران کے تاجدار خسرو پرویز نے روما کی مشرقی سلطنت کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد کچھ عرصہ کے لیے اناطولیہ کی طرح اس شہر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں اناطولیہ کا عظیم میدان بازنطینی حکومت پر پے در پے حملہ کرنے والے مسلمان مجاہدین کے قافلوں کی گزرگاہ بنا رہا۔ سنہ ۱۰۷۱ء میں ترکانِ آلِ سلجوق نے ملازجرہ کے مقام پر بازنطینی افواج کو فیصلہ کن شکست دی اور انقرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد تیرھویں اور چودھویں صدی کے وسطِ اوّل کے درمیان صلیبی جنگوں کے ادوار میں اناطولیہ کے دوسرے شہروں کی طرح انقرہ کو بھی متعدد بار یورپ کی وحشت و بربریت کا سامنا کرنا پڑا۔ سنہ ۱۳۵۴ء میں مشرقی بازنطینی سلطنت مکمل طور پر عثمانیوں کے ہاتھ میں چلی گئی اور انقرہ ہمیشہ کے لیے صلیبی جنگوں کے خطرے سے آزاد ہو گیا۔ سنہ ۱۴۰۲ء میں انقرہ کے قرب و جوار میں تاریخِ عالم کی وہ ہولناک ترین جنگ لڑی گئی، جس نے ایک مدت کے لیے مشرق و مغرب کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اس جنگ میں ایک طرف سلطان بایزید یلدرم تھا جس کے جاہ و جلال کے سامنے اقوامِ یورپ کے پرچم یکے بعد دیگرے سرنگوں ہو رہے تھے اور دُوسری طرف امیر تیمور تھا جس کی فتوحات کا سیلاب وسطِ ایشیا سے ہندوستان تک پہنچ چکا تھا۔ تاریخ میں واقعات کے اعتبار سے انقرہ یا انگورہ کی جنگ سے زیادہ بے مقصد اور نتائج کے اعتبار سے تباہ کن کوئی اور جنگ نہیں لڑی گئی۔

عالمِ اسلام کے مشرق و مغرب میں ان دو حکمرانوں کی سلطنتوں کی سرحدیں ارضِ روم اور دریائے فرات کے قریب آپس میں ملتی تھیں۔ جن

ایام میں تیمور ہندوستان کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا، اسے یہ اطلاع ملی کہ جارجیا اور اناطولیہ کے قریب بعض قبائل نے بغاوت کر دی ہے اور بایزید یلدرم ان کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ تیمور نے ہندوستان سے فارغ ہو کر اس جانب توجہ کی تو اس کے خوف سے بعض سردار بایزید یلدرم کی پناہ میں چلے گئے۔ اس واقعہ سے ان دو عظیم حکمرانوں کے درمیان کشیدگی شروع ہوئی۔ دونوں یکساں مغرور تھے۔ ایک ایشیا کا سب سے بڑا فاتح تھا اور دوسرا یورپ کے آخری گوشے تک اپنا پرچم نصب کرنے کی تیاری کر رہا تھا، لیکن اب دونوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ثابت کرنا تھا کہ مجھ سے بڑا کوئی نہیں۔ ایشیا کے فاتح نے پیغام بھیجا کہ "تم نے یورپ کے عیسائیوں پر چند فتوحات حاصل کی ہیں اور مغرور ہو گئے ہو۔ ذرا آنکھیں کھول کر ہماری فتوحات کی وسعت دیکھو اور ہمارے انتقام کی ان بجلیوں سے ڈرو، جو تمہارے سر پر گرنے والی ہیں۔" اور بایزید نے جواب دیا "بے شک تمہاری افواج بہت زیادہ ہیں، لیکن تم نے ابھی تک میرے سپاہیوں کی تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی۔ میں ان لوگوں کو تمہارے حوالے نہیں کروں گا، جنھوں نے مجھ سے پناہ مانگی ہے۔"

فریقین میں سے کسی ایک کے لہجے میں معمولی ملائمت بھی دوسرے کو مطمئن کر سکتی تھی، لیکن ان میں سے کوئی اس بات کے لیے تیار نہ تھا۔ انقرہ کے میدان میں بایزید یلدرم کے چار لاکھ اور امیر تیمور کے آٹھ لاکھ آزمودہ کار سپاہیوں کی زور آزمائی کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ طاقت ور کون ہے؟

سپاہیوں کی تعداد کی برتری کے علاوہ تیمور کا تیس سالہ جنگی تجربہ کام آیا اور بایزید کی افواج نے گھمسان کی جنگ کے بعد شکست کھائی۔ بعض روایات کے مطابق سلطان بایزید یلدرم کی شکست کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ جنگ کے

ایام میں گٹھیا کے مرض میں مبتلا تھا اور فیصلہ کن لڑائی کے وقت شدید درد کے باعث اس اولوالعزم سپاہی کی ذہنی صلاحیتیں جواب دے چکی تھیں۔ بہرحال اس جنگ میں امیر تیمور کی فتح کے باوجود تاریخ کے صفحات میں یہ مسئلہ زیر بحث رہے گا کہ ان دونوں میں سے بڑا کون تھا؟ لیکن اس امر کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ انقرہ کی جنگ تاریخ اسلام کا ایک انتہائی افسوسناک سانحہ تھا۔ یورپ کے مؤرخین جس قدر فرانس کی رزمگاہ میں عبدالرحمٰن الغافقی کی شکست کے واقعات سے خوشی محسوس کرتے ہیں، اُسی قدر انقرہ کے میدان میں ترکوں کی اس عظیم فوج کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے اطمینان کا اظہار کرتے ہیں جس کے سالار یورپ کے میدانوں کے لیے نقشے تیار کر رہے تھے۔ بایزید یلدرم کو آہنی پنجرے میں بند کرنے کا واقعہ ایک ایسی داستان ہے جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ فتح کے بعد اپنے شکست خوردہ حریف کے ساتھ تیمور کا سلوک وہی تھا، جس کی ایک بہادر انسان سے توقع کی جا سکتی ہے۔ اسے بڑی شدت کے ساتھ یورپ کے خلاف بایزید کے کارناموں کا احساس ہوا۔ چنانچہ جب بایزید ایک قیدی کی حیثیت میں اس کے سامنے لایا گیا تو اُس نے چند قدم آگے بڑھ کر اُس کا استقبال کیا۔ کچھ دن اسے اپنے ساتھ رکھنے کے بعد تیمور نے اپنے ہاتھوں سے بایزید کے سر پر تاج رکھا اور یہ وعدہ کیا کہ میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہاری کھوئی ہوئی عظمت واپس دلانے کی کوشش کروں گا، لیکن بایزید کی بے وقت موت کے باعث ان دو بہادر اور اولوالعزم انسانوں کی دوستی مشرق و مغرب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے سے قاصر رہی۔ شکست نے بایزید کی صحت پر جو ناخوشگوار اثر ڈالا، اس کے باعث وہ چند ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ تیمور نے اس کے علاج کے

لیے بہترین طبیبوں کی خدمات حاصل کیں، مگر کوئی افاقہ نہ ہُوا۔ کہا جاتا ہے کہ بایزید کی موت پر تیمور اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ اس کی میت پورے شاہی اعزاز کے ساتھ بُرسا پہنچائی گئی اور تیمور نے بایزید کے بیٹے موسیٰ کو بیش قیمت تحائف کے علاوہ اناطولیہ کی سلطنت تفویض کر دی۔ احمد بن عرب شاہ کے علاوہ کم و بیش تمام ایرانی مؤرخ بایزید کے ساتھ امیر تیمور کے حُسنِ سلوک کا اعتراف کرتے ہیں۔ اسے آہنی پنجرے میں بند کرنے کا قصہ بعض ایسے غیر معروف فرنگیوں نے مشہور کیا ہے جو کسی چھان بین کی بجائے اپنے ان بھائیوں کو خوش خبری دینا چاہتے تھے جو بایزید کو اپنا بدترین دُشمن سمجھتے تھے اور اس کی تذلیل اور رُسوائی سے متعلق ایسے افسانے سُن کر خوش ہوتے تھے۔

امیر تیمور کی واپسی کے بعد بایزید کے جانشین پھر ایک وسیع سلطنت کے مالک بن گئے۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) پر اسلام کا پرچم لہرا کر عالمِ اسلام کا ایک دیرینہ خواب پورا کر دیا۔ استنبول کی تسخیر کے بعد اناطولیہ کے شہروں کی حیثیت کم ہو گئی، تاہم مشرق کی طرف ترکی کے تجارتی راستے پر ایک اہم منزل ہونے کے باعث انقرہ، اناطولیہ کی ایک اہم تجارتی منڈی بنا رہا۔ اس شہر کی نئی شہرت کا آغاز اس وقت ہُوا جب مصطفےٰ کمال نے ۱۹۲۳ء میں اس قدیم شہر کو ترکی کا نیا دارالحکومت بنا دیا۔

انقرہ میں ہماری دیکھ بھال محکمۂ اطلاعات کے ایک انتہائی خوش اخلاق افسر مسٹر عطا کینٹ کے ذمّہ تھی۔ مسٹر عطا ان لوگوں میں سے تھے، جن کے ساتھ پہلی مرتبہ مصافحہ کرتے ہی اجنبیت کا احساس دُور ہو جاتا ہے۔

انقرہ میں قیام کے دوران میں سرکاری تقریبات میں حصّہ لینے کے بعد مجھے جو فرصت کا وقت ملتا تھا، وہ شہر کی سیاحت میں صرف ہوتا تھا۔ یہ خوبصورت شہر ٹیلوں اور وادیوں پر پھیلا ہوا ہے، لیکن کوئی ٹیلا اتنا بلند نہیں کہ اسے پہاڑی سے تشبیہہ دی جا سکے۔ رات کے وقت اگر کسی بلند مقام سے دیکھا جائے تو نشیب کے علاقوں میں بجلی کے قمقموں کی جگمگاہٹ ایک دلکش منظر پیش کرتی ہے۔ انقرہ کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ ہے، لیکن اس کی تعمیر کا کام ابھی جاری ہے اور آبادی میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ قدیم عمارات میں سے بارہویں اور تیرھویں صدی کی مساجد اب بھی وہاں موجود ہیں۔ شہر سے قریب ایک بلند ٹیلے پر قدیم قلعے کی دیوار کا کچھ حصّہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

(۷)

قونیہ کا سفر

انقرہ پہنچنے کے بعد میرے دل میں سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ یہاں سے استنبول کا رُخ کرنے سے قبل قونیہ کی سیر کر آؤں۔ قونیہ کے ساتھ میری دلچسپی کی دو وجوہ تھیں۔ ایک یہ کہ ترکی کے قدیم شہروں میں سے ہے اور کسی زمانے میں سلجوقی سلطنت کا دارالحکومت رہ چکا تھا اور اس سے چند صدیاں قبل مشرق سے جن مجاہدین کے قافلے قسطنطنیہ کی تسخیر کے لیے نکلا کرتے تھے، یہ شہر ان کے راستے کی ایک اہم منزل ہوا کرتا تھا ——
دوسری یہ کہ یہاں عالمِ اسلام کے عظیم ترین شاعر، مفکر اور درویش حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کا مزار ہے۔ مولانا رومؒ کے متعلق سعید صاحب کے جذبات مجھ سے مختلف نہ تھے اور بار بار یہ کہتے تھے —— "بھئی یہ کتنی بدنصیبی ہوگی کہ ہم ترکی آکر بھی رومی کے مزار پر حاضری دیئے بغیر چلے جائیں۔"
اگلے روز رات کے وقت ترکی کے وزیرِ اعظم عدنان مندریس کی طرف سے صدرِ پاکستان کے اعزاز میں دعوت کے موقعہ پر مسٹر قدرت اللہ شہاب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ "میں قونیہ سے ہو آیا

ہوں، مجھے تمام راستہ اس بات کا افسوس رہا کہ تم میرے ساتھ نہیں تھے۔ ہم نے گزشتہ رات قونیہ جانے کا پروگرام بنایا تھا اور علی الصبح ہماری تیاری اس قدر اچانک تھی کہ تمھیں اطلاع نہ دے سکے۔" اس کے بعد شہاب صاحب قونیہ کے ہوائی سفر اور مولانا رومؒ کے مزار کی زیارت کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے رہے اور میں اس بات پر تاسف کرتا رہا کہ میں ان کے ساتھ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد مسٹر عطا کینٹ نے مجھ سے پوچھا "مسٹر شہاب کہتے ہیں کہ آپ قونیہ جانا چاہتے ہیں؟"
"ہاں۔" میں نے جواب دیا "آپ ہمارے لیے ایک ٹیکسی کا انتظام کروا دیں۔"
دعوت سے فارغ ہونے کے بعد مسٹر کینٹ مجھ سے دوبارہ ملے اور کہا کہ کل آپ کے سفر کا بندوبست ہوگیا ہے اور اب آپ کو ٹیکسی لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگلے دن صدرِ پاکستان کو انقرہ کے ہوائی اڈے پر رُخصت کرنے کے بعد میں اور مولانا محمد سعید اپنے ہوٹل میں واپس آئے تو ہمیں قونیہ لے جانے کے لیے ایک کار ہوٹل کے دروازے پر کھڑی تھی۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب ہم نے قونیہ کا رُخ کیا۔ ہمارے دوسرے ساتھیوں کی مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ وہ ہمارا ساتھ نہ دے سکے۔
ڈرائیور کے ساتھ ایک اور نوجوان تھا، جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات کر سکتا تھا۔ جمعہ کا دن تھا اور ہم نے اپنے گائیڈ کو روانہ ہوتے وقت ہی یہ بتا دیا تھا کہ ہم راستے کی کسی مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے رُکنا چاہتے ہیں۔ انقرہ سے قونیہ کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ سو میل تھا اور ہمارا ڈرائیور شہر کے

مضافات سے نکلنے کے بعد تقریباً ستر (۷۰) میل فی گھنٹہ کے حساب سے کار چلا رہا تھا۔ اس کار پر ڈرائیور کے سامنے ایک چھوٹی سی تختی لٹک رہی تھی جس پر "الرزق علی اللہ" کے الفاظ کندہ تھے۔ کوئی آدھ یا پون گھنٹہ بعد سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی کی مسجد کے قریب کار رکی اور ہم اتر پڑے۔ ترک کسانوں کی اس بستی کی سب سے خوب صورت عمارت یہ مسجد تھی۔ میں نے وضو کے لیے کوٹ اتارا تو ایک دیہاتی نے پانی کا کوزہ بھر کر میرے سامنے رکھ دیا۔ وضو سے فارغ ہو کر اٹھا تو اس نے ایک صاف تولیہ پیش کر دیا۔

مسجد کے اندر قالین بچھے ہوئے تھے۔ جنھیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان لوگوں کی کمائی کا بیشتر حصہ اپنے گھروں کی بجائے خدا کے گھر کی آرائش پر صرف ہوتا ہے۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ بستی کے مکانات کی تعداد دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں ہر آدمی نماز پڑھتا ہے۔ جماعت میں ابھی کچھ دیر تھی اور خطیب صاحب ایک کتاب سے فارسی کے کسی شاعر کا نعتیہ کلام پڑھ رہے تھے۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد نمازیوں کو درود و سلام پڑھنا شروع کر دیتے۔ الفاظ وہی تھے جن سے ہر پاکستانی کے کان آشنا ہیں "الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ، والسلام علیک یا حبیب اللہ" کچھ دیر بعد منبر پر کھڑے ہو کر خطیب نے عربی زبان میں خطبہ پڑھا اور اس کے بعد جماعت کھڑی ہو گئی۔ ہم نماز سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو تمام نمازیوں کو قند کی ڈلیوں کا ایک ایک لفافہ اور گلاب کے عرق کا ایک ایک گھونٹ تقسیم کیا گیا۔ جب نمازی باری باری دروازے کے قریب پہنچتے تھے تو ایک شخص گلاب پاش سے عرق کے چند قطرے

ان کی ہتھیلی پر ڈال دیتا تھا اور وہ اسے پی لیتے تھے۔ دوسرا قند کی ڈلیوں سے بھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے لفافے ان کو تقسیم کرتا جاتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہر جمعہ کی نماز کے بعد اسی طرح گلاب کا عرق اور قند تقسیم کی جاتی ہے۔

ہم اپنے ان بھائیوں کے ساتھ کوئی بات نہ کر سکے۔ ہم ان سے بہت کچھ کہنا اور سننا چاہتے تھے، لیکن ہماری زبانیں مختلف تھیں۔ ان کی محبت بھری نگاہوں کے جواب میں ہم بار بار "پاکستان" کا لفظ دہرا سکتے تھے اور ان کے لیے یہی کافی تھا۔ یہ لوگ غریب تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جن کے لباس میں پیوند لگے ہوئے تھے، لیکن ان کے چہروں پر جو قناعت اور آسودگی نظر آ رہی تھی وہ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ ان کی طرف سے قند اور گلاب کا تحفہ ایک عظیم قوم کی طبعی سعادت کا آئینہ دار تھا۔ اس چھوٹی سی بستی کے لوگ ترکی کی اسی فیصد آبادی کی نمائندگی کرتے تھے۔ ہم لوگ برسوں سے یہ سن رہے تھے کہ ترکی اسلام سے دور جا چکا ہے۔ ترکی کی مساجد میں تالے لگا دیے گئے ہیں۔ وہاں عربی زبان میں کوئی نماز نہیں پڑھتا۔ میں نے قونیہ تک سفر کرتے ہوئے راستے میں سڑک کے دائیں بائیں کئی بستیاں دیکھیں اور ہر بستی میں مسجد کی ایک امتیازی شان نظر آتی تھی۔ مسجد سے باہر نکلنے کے بعد مولانا محمد سعید نے کہا "میرے آقا! تجھ پر خدا کی لاکھ لاکھ رحمتیں ہوں۔ دنیا کے کس کس گوشے میں تیرا نام لیا جاتا ہے۔" کار میں بیٹھنے کے بعد ہم نے قند کی کچھ ڈلیاں اپنے ساتھیوں کو پیش کیں تو انھوں نے اس کے بدلے میں ہمیں کاغذ کے دو بڑے لفافے پیش کر دیے، ایک میں خمیری روٹیاں اور پنیر کے چند ٹکڑے تھے اور دوسرے میں انگور کے چند خوشے۔

"آپ نے یہ تکلیف کیوں کی؟" میں نے پوچھا۔

ڈرائیور کے ساتھی نے جواب دیا "ہمیں بھوک لگ رہی تھی اور ہم بستی سے کھانا کھا آئے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ کو بھی بھوک لگ رہی ہو گی، اس لیے آپ کا حصہ لے آئے ہیں۔"

اب اناطولیہ کا میدان زیادہ وسیع اور ہموار نظر آ رہا تھا اور ہوا کی خنکی میں ہر آن اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ وہ میدان تھا، جہاں ماضی میں مشرق و مغرب کے درمیان کئی معرکے ہو چکے تھے۔ اناطولیہ کی خاک کے ایک ایک ذرے پر ترکوں کی شجاعت کی داستانیں نقش تھیں۔ میں گھر سے دیارِ حرم کی زیارت کا ارادہ لے کر نکلا تھا اور یہ کتنا حسین اتفاق تھا کہ وہاں پہنچنے سے قبل میں ان مجاہدوں کا وطن دیکھ رہا تھا، جنھوں نے صدیوں حرم کی پاسبانی کی تھی۔ ترکوں کے ہزار سالہ ماضی کی تاریخ کے بیشتر صفحات ان جنگوں کے تذکروں سے لبریز ہیں، جو اسلام کی سربلندی کے لیے لڑی گئی تھیں۔ دنیا کی کوئی قوم ان قربانیوں کی مثال پیش نہیں کر سکتی، جو ترکوں نے اسلام کے لیے دی ہیں۔ یہ لوگ عالمِ اسلام کے مغربی حصار کے ہی محافظ نہ تھے، بلکہ انھوں نے ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کی وحشت و بربریت کے اس سیلاب کو روکا تھا، جو عالمِ اسلام کے بعد پورے مشرق کے لیے ایک خطرۂ عظیم بن سکتا تھا۔ ہلال اور صلیب کی جنگیں صرف کفر و اسلام کے ہی عظیم معرکے نہ تھیں، بلکہ ان جنگوں نے صدیوں کے لیے مشرق و مغرب کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اگر ترک مغربی استبداد کی آندھیوں کا مقابلہ نہ کرتے تو وہ اقوام جنھوں نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپ کے تاجروں کی ہوسِ ملک گیری کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے، صدیوں قبل یورپ کی غلامی کا طوق پہننے پر مجبور ہو جاتیں۔

اگر بارہویں صدی میں ترک مجاہدین کی تلواریں علمبردارانِ صلیب کی جارحیت کے خلاف بے نیام نہ ہوتیں تو باقی ایشیا میں کوئی پہاڑ، کوئی دریا اور کوئی صحرا ایسا نہ تھا، جو مغرب کی جارحیت کے اس سیلاب کو روک سکتا۔

ترکوں کی سب سے بڑی متاع ان کی رگوں کا خون ہے اور اسلام کے ماضی کی تاریخ کو رنگینی عطا کرنے کے لیے وہ اس متاعِ گراں کو بے دریغ لٹاتے رہے ہیں۔ زمانے کا کوئی انقلاب اپنے پرشکوہ اور قابلِ فخر ماضی سے ترکوں کا رشتہ منقطع نہیں کر سکتا اور ان کا ماضی اسلام کا ماضی ہے!

قونیہ میں داخل ہوتے ہی ہم نے سیدھے مولانا رومؒ کے مزار کا رخ کیا۔ مزار کی عمارت زیادہ بڑی نہ تھی، لیکن اس کی اندرونی آرائش ترکوں کی خوش ذوقی کی دلیل تھی۔ گنبد کے نیچے ایک کشادہ کمرے میں مولانا رومؒ کے علاوہ ان کے سلسلہ کے چند اور بزرگوں کی قبریں تھیں۔ ہر قبر پر قیمتی غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ ہر قبر کے سرہانے قدِ آدم ستون تھے، جن کے اوپر بڑے بڑے عمامے رکھے ہوئے تھے۔ یہ عمامے عظمت اور بزرگی کا نشان تھے۔ اسی ہال میں مولانا رومؒ کا لباس اور ان کی بڑی بڑی تسبیحیں رکھی ہوئی تھیں۔ مولانا کے مرشد حضرت شمس تبریز کی کلاہِ مبارک بھی یہاں موجود تھی۔ ایک جگہ دائرے میں رقص کرنے والے درویشوں کی پتلیاں یادگار کے طور پر رکھی ہوئی تھیں۔ گنبد کے کسی گوشے سے کوئی نہایت ہلکے اور میٹھے سروں میں نے بجا رہا تھا۔ کئی ترک عورتیں اور مرد دست بدعا تھے۔ ہم نے فاتحہ پڑھی اور باہر نکل آئے۔ مولانا رومؒ کے مزار پر یہ شعر لکھا ہوا تھا:

کعبۂ عشاق باشد ایں مقام
ہر کہ ناقص آمد ایں جا شد تمام

مزار کے ساتھ ہی ایک عالی شان مسجد ہے۔ اگرچہ عصر کی نماز ہو چکی تھی تاہم نمازیوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ ہم نے نماز ادا کی۔ مزار کے بیرونی دروازے پر ایک دکان سے مجھے مولانا روم کی قلمی تصویر اور ان کے مزار کا فوٹو مل گیا۔ قونیہ میں کئی مساجد اور تاریخی عمارتیں دیکھنے کے قابل تھیں، لیکن وقت کی تنگی کے باعث ہم اس قدیم شہر کو جی بھر کر نہ دیکھ سکے۔ واپسی پر راستے میں ہم اپنے دائیں بائیں ان مساجد اور خوبصورت عمارات کو دیکھ رہے تھے جن کے در و دیوار پر ترکوں کے ماضی کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ قونیہ سے چند میل آگے سورج غروب ہو چکا تھا اور سردی میں ہر آن اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم رات کے کوئی آٹھ بجے کے قریب انقرہ پہنچ گئے۔

اگلے دن علی الصبح میں ٹرکش ائرلائنز کے طیارے پر انقرہ سے استنبول کا رخ کر رہا تھا۔ مولانا سعید اور ہمارے دوسرے ساتھیوں کے لیے گاڑی پر سفر کا بندوبست ہو چکا تھا اس لیے وہ میرا ساتھ نہ دے سکے۔

انقرہ سے روانگی

انقرہ میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران میں نے جدید ترکی کے متعلق جو معلومات حاصل کی تھیں، وہ بے حد حوصلہ افزا تھیں۔ موجودہ حکومت کے سامنے اولین مسئلہ ملک کو خود کفیل بنانا ہے اور اس مقصد کے لیے ملک کے زرعی اور صنعتی وسائل کو بروئے کار لانے کی مہم جاری ہے۔

ترکی بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور یہاں ملک کی ضرورت سے زیادہ قابل کاشت اراضی موجود ہے۔ حکومت غیر آباد علاقوں کو آباد کرنے کے لیے جن منصوبوں پر عمل کر رہی ہے، ان کی تکمیل کے بعد آئندہ چند سال کے اندر اندر ترکی کی زرعی پیداوار اتنی ہو جائے گی کہ ملک کی ضروریات پوری کرنے کے بعد اسے باہر کی منڈیوں میں اپنا غلہ بھیجنا پڑے گا۔

مجھے حکومت کے ایک ذمہ دار رکن نے بتایا کہ ہمارے زرعی وسائل اتنے ہیں کہ انھیں بروئے کار لانے کے بعد آئندہ نصف صدی تک بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ ترکی کے لیے کسی پریشانی کا باعث نہ ہوگا۔ صنعتی لحاظ سے ترکی اتنی ترقی کر چکا ہے کہ اسے بیشتر ضروریات کی چیزیں باہر سے درآمد

کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ترک بیرونی مصنوعات کے مقابلے میں ملکی مصنوعات کو ترجیح دیتے ہیں۔ عوام اور خواص، امیر اور غریب سب وہ کپڑا پہننا پسند کرتے ہیں جو ان کے اپنے ملک میں بنتا ہے۔ ترکی میں لباس دُوسرے ممالک کی طرح آرائش و زیبائش کی خاطر نہیں بلکہ تن ڈھانپنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ملکی مصنوعات کے معاملہ میں حکومت کی سرپرستی کا یہ حال ہے کہ ترکی میں ولایتی ادویات تک درآمد نہیں کی جاتیں۔

مجھے انقرہ میں زکام کے لیے دوا کی ضرورت پیش آئی۔ میں مسٹر کینٹ کو ساتھ لے کر کئی دکانوں پر گیا، لیکن مجھے جن ولایتی ادویات کے نام یاد تھے، ان میں سے وہاں کوئی بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ بالآخر مجھے ایک مقامی دوا پر اکتفا کرنا پڑا اور یہ دوا ان تمام ادویات سے زیادہ موثر ثابت ہوئی، جنھیں میں اس سے قبل آزما چکا تھا۔

ترکی بڑی تیزی کے ساتھ ایک خوشحال مستقبل کی طرف قدم اُٹھا رہا ہے، لیکن اس کی موجودہ اقتصادی حالت زیادہ اطمینان بخش نہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حکومت اپنی بیشتر آمدنی ان تعمیری منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں صرف کر رہی ہے جن کے مفید نتائج چند سال بعد ظاہر ہوں گے۔

ترکی کی سب سے بڑی مشکل غیر ملکی زرِ مبادلہ کی کمی ہے۔ ترکی کے پاس صرف تمباکو ایسی چیز ہے، جس کی برآمد سے اُسے بیشتر زرِ مبادلہ حاصل ہوتا ہے اور حکومت کے نزدیک اس زرِ مبادلہ کا بہترین مصرف یہی ہے کہ اسے مستقبل کی خوشحالی کے منصوبوں کی تکمیل کے لیے کام میں لایا جائے۔

عوام اس صورتِ حال سے پریشان نہیں ہیں، ہر قوم کی تعمیرِ جدید

میں ایک ایسا دَور آتا ہے، جبکہ اجتماعی خوشحالی کے پروگرام کو افراد کی فوری ضروریات پر مقدم سمجھا جاتا ہے۔ ترکی اس لحاظ سے یقیناً خوش قسمت ہے کہ وہاں افراد اجتماعی بھلائی کے لیے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ جدید ترکی میں ترقی کا تصور یہ ہے کہ ان کا ہر کسان اپنے کھیت میں ٹریکٹر چلا رہا ہو۔

ترک اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ ان کے پاس پٹرول نہیں ہے اور حکومت ملک میں صنعتی اور زرعی انقلاب لانے کے لیے جو عظیم منصوبے بنا رہی ہے، ان کے باعث وہاں پٹرول کی احتیاج اور بڑھ جائے گی۔ ایک موقع پر ایک ترک نوجوان سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے میں نے کہا تھا:

”تم قدرت کی تمام نعمتوں کے حقدار ہو، لیکن مجھے افسوس ہے کہ تمہارے پاس پٹرول نہیں ہے۔ اگر میرے بس میں ہو تو بحیرۂ مارمورا اور باسفورس کا سارا پانی پٹرول میں تبدیل کر دوں“ ——— اور اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا کہ اگر یہ بات ہو جائے تو جتنا پٹرول ہماری ضرورت سے زائد ہو گا، وہ سارا پاکستان کو بھیج دیا جائے گا، لیکن ترکوں کو زندہ رہنے کے لیے پٹرول سے زیادہ خون کی ضرورت ہے اور آپ یہ دُعا مانگیں کہ خدا کی یہ نعمت ہمارے پاس موجود رہے۔ پٹرول کی کمی ہم خود پوری کر لیں گے۔

آج مشرق و مغرب کے ہر چھوٹے اور بڑے ملک کے نزدیک اہم ترین خارجی مسئلہ اشتراکی جارحیت ہے۔ یہ مسئلہ ترکوں کے نزدیک بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، لیکن دنیا کا کوئی ایسا ملک، جس کی سرحد رُوس کے ساتھ ملتی ہو، اپنے حال اور مستقبل کے متعلق ترکوں سے زیادہ پُرامید اور مطمئن

نہیں ہوگا۔ اس قوم کی جبلّت خوف کے لفظ سے نا آشنا ہے۔ انھوں نے اپنی تاریخ سے خطرات کے سامنے سینہ سپر ہونا سیکھا ہے، بھاگنا نہیں سیکھا۔ یہ اس وقت بھی درست تھا جب کہ ان کی سلطنت دجلہ سے لے کر ڈینیوب تک پھیلی ہوئی تھی، جب کہ ان کا پرچم عالمِ اسلام کا پرچم سمجھا جاتا تھا اور یہ آج بھی درست ہے جب کہ ان کی سرحدیں سینکڑوں میل سمٹ چکی ہیں۔ ترک ایک دشمن کی دوستی کا احترام کر سکتے ہیں، لیکن طاقت کے سامنے سر جھکانا نہیں جانتے۔ وہ موجودہ دور کی جنگوں کی ہولناکیوں سے واقف ہیں اور ان کی نسل کے لاکھوں افراد ابھی وہ ہیں جنھوں نے مغربی سامراج کے ساتھ گزشتہ جنگ کی ہولناکیاں دیکھی ہیں۔ اس لیے وہ آگ اور خون کے کسی طوفان سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے، لیکن بڑی سے بڑی مصیبت کا خوف انھیں طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ یہ ان کی سرشت اور ان کی قومی روایات کے منافی ہے۔ ترک صرف اس وقت تک سیاستدان ہوتا ہے جب تک کہ سمجھنے سمجھانے کی امن پسندانہ کوششوں سے کوئی مسئلہ طے ہونے کی امید باقی رہتی ہو، لیکن جب ان کا مدمقابل منطق کی جگہ طاقت استعمال کرنے پر اتر آتا ہے تو ترک صرف سپاہی رہ جاتے ہیں۔

روس کے ساتھ اپنے ماضی اور حال کے تعلقات کے پیشِ نظر آج ہر ترک اپنے مستقبل کے متعلق ایک سپاہی کے ذہن سے سوچتا ہے۔ اس سپاہی کے ذہن سے جو اپنی سنگین کو اپنے وطنِ عزیز کی عزت اور آزادی کی پہلی اور آخری ضمانت سمجھتا ہے۔ میں یہاں صرف ایک واقعہ کا ذکر کروں گا، جس کو بیان کرتے ہوئے ہر ترک کی آنکھیں ایک قومی جذبۂ افتخار سے چمک اٹھتی ہیں۔

ہے کہ بحرِ اسود سے آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال کے راستے بحیرۂ روم تک رسائی حاصل کرنا روس کا ایک پرانا خواب ہے اور روس کا یہ خواب اس لیے پورا نہیں ہو سکا کہ وہ ہمیشہ طاقت کی منطق سے کام لینا چاہتا تھا اور ترکوں نے طاقت کی منطق کے سامنے ہتھیار ڈالنا نہیں سیکھا۔ گزشتہ جنگِ عالمگیر میں برطانیہ اور فرانس کے حلیف بن جانے کے بعد جب روس کو یہ امید پیدا ہوئی کہ اب اگر درۂ دانیال کی طرف پاؤں پھیلانے کی کوشش کی جائے تو مغرب کے اتحادی کوئی مداخلت نہیں کریں گے اور ترکی کسی بیرونی اعانت سے ناامید ہو کر مزاحمت کی جرأت نہیں کرے گا، تو روس نے معاندانہ پروپیگنڈے سے ترکی کو مرعوب کرنے کی مہم شروع کی۔ ترکی اس جنگ میں غیر جانبدار رہنے کے لیے کوشاں تھا اور ترکی کے وزیرِ خارجہ اس معاملہ میں اپنی نیک نیتی کا ثبوت دینے کے لیے ماسکو پہنچے۔ سٹالن نے سمجھا کہ یہ روس کی دھمکیوں کا اثر ہے اور اس نے ترکی کے وزیرِاعظم کو اور زیادہ مرعوب کرنے کے لیے تین دن تک اس کے وزیرِ خارجہ سے ملاقات نہ کی اور پھر جب ملاقات کی تو سٹالن نے کسی تمہید کی ضرورت محسوس کیے بغیر درۂ دانیال کا مطالبہ پیش کر دیا۔ ترکی کے وزیرِ خارجہ نے تن کر جواب دیا:

"درۂ دانیال کی چابی میں ترک سپاہی کی جیب میں چھوڑ آیا ہوں اور روس ترک سپاہی کو موت کے گھاٹ اتار کر ہی یہ چابی حاصل کر سکتا ہے۔"

ترکی کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مجھے جو بات سب سے قابلِ فخر نظر آئی، وہ یہ تھی کہ ترک پاکستان کو اپنا بہترین دوست سمجھتے ہیں۔ انھیں عقیدت اور محبت کے ان جذبات کا پورا احساس ہے، جو پاکستانیوں کے دلوں میں

ترکوں کے لیے موجزن ہیں۔ ترک نمائشی آداب اور ظاہری تکلفات کے عادی نہیں۔ ان کی گفتگو ہمیشہ کسی تصنع کے بغیر ہوتی ہے، لیکن جب وہ بولتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آواز ان کی زبان سے نہیں، دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہے۔ وہ بلاوجہ آگے بڑھ بڑھ کر ہاتھ ملانے کی کوشش نہیں کرتے لیکن ایک پاکستانی کو ان کے چہرے کے ہلکے سے تبسم میں محبت اور خلوص کے دریا موجزن دکھائی دیتے ہیں۔

آج ترکی پاکستان کا ایک تندرست اور توانا ساتھی، قابل اعتماد اور قابل فخر دوست اور قابل احترام بھائی ہے۔

ایک پاکستانی کے لیے یہ بات یقیناً حوصلہ افزا ہے کہ ترک بڑی تیزی سے دوبارہ اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ وہاں گزشتہ چند برس میں ہزاروں مساجد تعمیر ہو چکی ہیں اور کئی دینی مدارس کھل چکے ہیں۔ اگر ترکی میں اسلام کے احیاء کی رفتار یہی رہی تو یہ بعید از قیاس نہیں کہ ترک پھر اس عظیم ملت کے وجود کا ایک تندرست اور توانا جزو بن جائیں جیسے گزشتہ صدیوں کی طرح آج بھی اُن کی احتیاج ہے۔

(۹)

استنبول (قسطنطنیہ)

انقرہ سے پرواز کے چند منٹ بعد ہمارا طیارہ گہرے بادلوں میں سے گزر رہا تھا۔ کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے بادل چھٹ جاتے اور ہمیں کسی پہاڑی یا وادی کا دلکش منظر دکھائی دینے لگتا۔ کوئی گھنٹہ بھر کی پرواز کے بعد طیارہ بادلوں کی آغوش سے نکلا اور ہمیں اچانک قسطنطنیہ کے دل فریب مناظر دکھائی دینے لگے۔

اقوامِ مغرب کا بازنطین اور قسطنطنیہ اور ترکوں کا اسلامبول یا استنبول ایشیا کو یورپ سے جُدا کرنے والی آبنائے باسفورس اور بحیرۂ مارمورا کے کناروں پر واقع ہے۔

باسفورس عبور کرنے کے بعد ہم ایشیا سے یورپ میں داخل ہو چکے تھے۔ شہر کے اُوپر سے پرواز کرنے کے بعد ہوائی جہاز استنبول کے ہوائی اڈے پر اُترا۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کوئی نو بجے کا وقت تھا اور میں باقی سارا دن شہر کی سیاحت میں صرف کرنا چاہتا تھا،

لیکن ہوائی اڈے سے قدیم شہر تک پہنچتے پہنچتے بارش تیز ہوگئی اور میں نے ٹیکسی پر بیٹھے بیٹھے اس عظیم شہر کے چند مناظر دیکھنے کے بعد ڈرائیور کو پارک ہوٹل کا رُخ کرنے کے لیے کہا، جہاں میرے لیے کمرہ مخصوص تھا۔ باقی سارا دن میں نہایت بے تابی کے ساتھ بارش تھمنے کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی چار بجے کے قریب مطلع صاف ہُوا اور محکمۂ سیاحت کے دو افسر میرے پاس آئے۔ انھیں انقرہ سے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ میرے دو دوسرے ساتھی بذریعہ ٹرین شام کے وقت پہنچ رہے ہیں اور انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ قدیم شہر دیکھنے کے لیے یہ وقت تنگ ہے، اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ آبنائے باسفورس عبور کرکے مشرقی یا ایشیائی آبادی دیکھ آئیں اور وہیں سے ہم آپ کے ساتھیوں کو لینے کے لیے ریلوے اسٹیشن چلے جائیں گے۔ اس کے بعد سارا دن آپ باسفورس کے مغربی کنارے استنبول کی جدید اور قدیم بستیوں کی سیر کرسکیں گے۔

چائے پینے کے بعد میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہم باسفورس کے مغربی ساحل پر کھڑے تھے اور ہمیں دوسری طرف کوئی نصف یا پون میل کے فاصلہ پر باسفورس کا ایشیائی کنارہ دکھائی دے رہا تھا۔ باسفورس پر کوئی پُل نہیں اور آمد و رفت کے لیے جہاز استعمال کیے جاتے ہیں، جن پر مسافر اپنی کاروں سمیت سوار ہوجاتے ہیں۔ ہم اس وقت وہاں پہنچے جب ایک جہاز بھر چکا تھا اور اس میں ہماری کار کے لیے جگہ نہ تھی۔ چند منٹ بعد دوسرا جہاز پہنچ گیا اور ہم اس پر سوار ہونے سے چند منٹ بعد یورپ سے نکل کر ایشیائی سرزمین میں داخل ہوگئے۔ ہمیں جتنا وقت آبنائے باسفورس عبور کرنے میں لگا، اس سے زیادہ وقت جہاز پر چڑھنے اور اُترنے میں لگا۔

اب رات ہوچکی تھی۔ ہم گلیوں اور بازاروں سے گزرنے کے بعد اناطولیہ کے ریلوے کے آخری اسٹیشن پر پہنچے۔ وہاں کچھ دیر انتظار کے بعد انقرہ کی ٹرین پہنچ گئی اور میں نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دوبارہ آبنائے باسفورس عبور کرنے کے بعد ہوٹل کا رُخ کیا۔ ہوٹل پہنچ کر ہم نے رات کا کھانا کھایا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ کے افسروں کے ساتھ اگلے روز صبح کے پروگرام کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

استنبول میں ہماری سب سے بڑی دلچسپی حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مزار اقدس تھا اور یہ فیصلہ ہوا کہ ہم سب سے پہلے وہاں حاضری دیں گے۔

اگلی صبح ہم پارک ہوٹل سے، جو استنبول کی جدید آبادی میں واقع ہے نکل کر جدید شہر کا رُخ کر رہے تھے۔ جس طرح آبنائے باسفورس یورپ اور ایشیا کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتی ہے، اسی طرح ایک تنگ خلیج جو آبنائے باسفورس سے نکل کر چند میل خشکی کے اندر چلی جاتی ہے، استنبول کے قدیم و جدید شہر کو ایک دوسرے سے جُدا کرتی ہے۔ اس خلیج کو جس نے باسفورس کی طرح قدیم قسطنطنیہ کے دفاع میں ایک اہم پارٹ ادا کیا ہے اہلِ مغرب گولڈن ہارن (GOLDEN HORN) کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ترک اسے قلیچ کہتے ہیں۔ خشکی کی طرف گولڈن ہارن کا آخری سرا ایک چھوٹے سے دریا کے دہانے کے ساتھ مل جاتا ہے۔ گولڈن ہارن پر دو پُل جدید اور قدیم آبادی کو آپس میں ملاتے ہیں۔ چنانچہ استنبول یا قدیم قسطنطنیہ کا جو صدیوں تک دُنیا کے بڑے بڑے فاتحین کی نظر میں بازنطینی حکومت کا ناقابلِ تسخیر قلعہ تھا، محلِ وقوع حسبِ ذیل ہے:

شمال کی طرف خلیج یا گولڈن ہارن، جنوب اور مشرق کی طرف بحیرہ مارمورا

اور آبنائے باسفورس' اور مغرب کی طرف خشکی۔

گولڈن ہارن کا پُل عبور کرنے کے بعد ہم اس قدیم شہر میں داخل ہوئے جس کی ایک ایک اینٹ پر یورپ اور ایشیا کے تاریخی مدّوجزر کی داستانیں ثبت ہیں۔ ہماری پہلی منزل اس عظیم المرتبت صحابی کا مزارِ اقدس تھا' جسے مدینہ منورہ میں سب سے پہلے آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ کئی انصار اس سعادت کے لیے چشم براہ تھے' لیکن حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مقدر کا ستارہ چمکا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ اُن کے دروازے کے سامنے آکر بیٹھ گئی اور حضورؐ وہاں ٹھہرنے پر رضامند ہوگئے۔ یہ کتنی بڑی سعادت تھی' لیکن قدرت کی طرف سے میزبانِ رسولؐ کے لیے کئی اور سعادتیں بھی مقدر تھیں۔ ان کی زندگی کی آخری سعادت یہ تھی کہ وہ بڑھاپے کی عمر میں ان مجاہدین کے ہم رکاب تھے' جنھوں نے پہلی بار قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا۔ آپ قسطنطنیہ کے محاصرے کے دوران ہی جاں بحق ہوئے اور وہیں دفن کر دیے گئے۔ اس کے بعد صدیوں تک کسی کو ان کی قبر کا نشان تک معلوم نہ تھا۔ قریباً سات سو سال بعد سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا تو ایک بزرگ کو جو غالباً سلطان محمد کے اُستاد تھے' کشف کے ذریعے آپؓ کی قبر کا پتہ چلا اور آپؓ کا مزار اور اس کے ساتھ ہی ایک خوب صورت مسجد تعمیر کی گئی' جسے ایوب مسجد کہا جاتا ہے۔ اس مردِ حق آگاہ کے مزار کی عمارت اور اس کی دیکھ بھال ترکوں کی طبعی خوش ذوقی کی دلیل ہے۔ چند ترک مرد اور عورتیں انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگ رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ جمعہ کے روز یہاں ہزاروں زائرین آتے ہیں اور ترکوں کا یہ عام عقیدہ ہے کہ جو نیک دعا مانگی جاتی ہے' وہ پوری

ہوتی ہے۔ اپنے احساسات بیان کرنے کے لیے مجھے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ پاس ہی چنار کا ایک پُرانا درخت تھا' جس کی شاخیں مزار کے گنبد کو چھو رہی تھیں۔ آس پاس ہزاروں کبوتر اُڑ رہے تھے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم نے مسجد ایوبیہ کی زیارت کی اور باہر نکل آئے۔

اس کے بعد ہم سینٹ صوفیا کی عظیم الشان عمارت دیکھنے کے لیے چل دیے' جو ایا صوفیہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عمارت قسطنطنیہ کی فتح کے بعد مسجد بننے سے قبل سلطنتِ رُوما کا ایک عظیم گرجا تھی' جسے ۳۲۶ء میں شہنشاہ قسطنطین نے فتح کیا تھا۔ تعمیر کے ستاون سال بعد یہ گرجا آگ لگ جانے سے تباہ ہوگیا تھا اور شہنشاہ تھیوڈوسیس نے دوبارہ تعمیر کیا تھا' لیکن ۵۳۲ء کی بغاوت میں اس عمارت کو دوبارہ تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد جسٹینین نے اسے زیادہ وسیع پیمانے پر تعمیر کرایا اور اس کے طول و عرض میں کچھ اضافے کیے' لیکن ۵۵۸ء میں زلزلے کے باعث اس کا گنبد مسمار ہوگیا۔ چنانچہ اسے ایک بار پھر تعمیر کرنا پڑا۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد اس عمارت میں چند اضافے کیے اور اسے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ ۱۹۳۵ء میں کمال اتاترک نے اسے ایک تاریخی یادگار کی حیثیت دے دی اور سیاحوں کے لیے اس کے دروازے کھول دیے۔

استنبول کی دوسری بڑی عمارت جو سینٹ صوفیا کے مقابلے میں ہر لحاظ سے بہتر عمارت ہے' مسجد سلیمانیہ ہے۔ یہ مسجد سلیمان عالیشان نے تعمیر کرائی تھی۔ اپنے بیرونی منظر اور اندرونی رعنائی کے لحاظ سے یہ عمارت سینٹ صوفیا کی عمارت سے کہیں زیادہ دلکش ہے اور اس کا گنبد بھی اُس کے گنبد سے زیادہ بڑا ہے۔ سلیمان عالی شان اپنے جاہ و جلال کے اعتبار

سے عثمانی دور کا عظیم ترین حکمران تھا اور مسجد سلیمانیہ کی پرشکوہ عمارت میں اس کے جاہ و جلال کی جھلک نظر آتی ہے۔

قدیم ترکی کی ہر عمارت کی تعمیر میں سرما کی برف باری کے اثرات کو ملحوظ رکھا جاتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ بڑی سے بڑی عمارت کی تمام چھت ایک ہی بڑے گنبد کے نیچے لائی جاتی تھی۔

میں نے مسجد سلیمانیہ کے گنبد سے بڑا کوئی گنبد نہیں دیکھا، لیکن مجھے بتایا گیا کہ ایڈریانوپل کی ایک مسجد اس سے بھی بڑی ہے اور ان دونوں مساجد کو ایک ہی معمار نے تعمیر کیا تھا، جس کا نام سنان تھا۔

مسجد سلطان احمد جسے نیلی مسجد بھی کہا جاتا ہے، استنبول کی ایک اور عظیم الشان عمارت ہے۔ یہ مسجد ۱۶۰۹ء-۱۶۱۶ء کے درمیان سلطان احمد اول کے دورِ حکومت میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کی پہلی خصوصیت جو دور سے ایک سیاح کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے، اس کے چھ مینار ہیں۔

استنبول میں عثمانی دور کی پانچ سو مساجد موجود ہیں اور ان میں سے بیسیوں ایسی ہیں، جنھیں دنیا کی شاندار عمارتوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ایک دن صرف مسجد سلطان احمد کی دلکشی اور رعنائی کا جائزہ لینے کے لیے کافی نہیں تھا۔ پھر جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، پرانے شہر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں، جس کی ظاہری دلکشی اور تاریخی اہمیت ایک سیاح کو گھنٹوں اور پہروں دیکھنے کی دعوت نہیں دیتی۔ ایک انتہائی مختصر عرصہ میں استنبول کی سیر کے بعد میں جو تاثر لے کر آیا ہوں، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شہر کو جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہے تو اسے دنوں کی بجائے ہفتوں یا مہینوں کا پروگرام بنا کر

جانا چاہیے۔

مسجد سلطان کے بعد ہم ایک اور مسجد کی زیارت کے لیے گئے، جسے قسطنطنیہ کے فاتح سلطان محمد ثانی نے ۱۴۷۰ء میں تعمیر کیا تھا۔ ۱۷۶۶ء کے زلزلے میں اس مسجد کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ یہ عمارت بھی ایک عظیم حکمران کی شان و شوکت کی نمائندگی کرتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک خوبصورت مزار ہے، جس میں سلطان محمد فاتح اور ان کی اہلیہ گل بہار خاتون محوِ خواب ہیں۔

استنبول کی ایک اور قابلِ دید تاریخی عمارت عثمانی سلاطین کا قدیم محل ہے جسے اب ایک قومی عجائب گھر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ گولڈن ہارن کے کنارے اس عجائب گھر کے باغات ایک دلکش منظر پیش کرتے ہیں اور گزرگاہ کے کناروں پر سرو کے درختوں کی قطاریں دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں شاہانِ مغلیہ کی کسی قدیم عمارت کی سیر کر رہا ہوں۔ محل کے مختلف کمروں میں عثمانی دور کے ان عظیم حکمرانوں کی ان گنت یادگاریں رکھی ہوئی ہیں، جن کی سلطنت اپنے عروج کے زمانے میں یورپ کی طرف پولینڈ کی سرحدوں سے لے کر بحیرۂ ایڈریاٹک کے ساحل تک، ایشیا میں باکو سے لے کر بصرہ اور عدن تک، اور افریقہ میں نیل کی وادی سے لے کر الجیریا تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے لباس، ان کی کلاہ اور عمامے، ان کے استعمال کے برتن، ان کے جواہرات، آرائش و زیبائش کے سامان، اور ان کے سکے اور اسلحہ جات سب یہاں موجود ہیں۔

دنیا میں شاید ہی کوئی میوزیم ایسا ہو، جسے دیکھنے کے بعد کئی صدیوں کی تاریخ اور تمدن کے ادوار اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے نہ آ جاتے ہوں۔

ترکوں نے اپنے ماضی کی کوئی یادگار ضائع نہیں ہونے دی۔ ان

یادگاروں کو جس ترتیب اور سلیقے سے رکھا گیا ہے، اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس محل کے مقیم ابھی تک یہاں موجود ہیں۔ ترک حکمرانوں کے پاس مشرق اور مغرب کے نوادرات جمع کرنے کے وسائل موجود تھے اور اس عجائب خانے کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے وسائل سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

یہاں چینی کے سینکڑوں ایسے برتن ہیں، جنھیں صدیوں پرانے آرٹ کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مغرب کی شیشہ گری اور مصوری کے ان گنت شاہکار بھی یہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ خطاطی کے نمونے تھے۔ قرآن حکیم سے لے کر دیواروں پر آویزاں طغروں تک ہر چیز اس فن کا ایک شاہکار معلوم ہوتی تھی۔

عثمانیوں کے عروج کے دور میں مشرق میں خطاطی کا فن اپنے انتہائی کمال کو پہنچ چکا تھا اور عثمانیوں سے زیادہ اس آرٹ کا سرپرست اور کون ہو سکتا تھا؟ اس میوزیم میں ایک ایک طغریٰ دیکھنے والے کو پہروں جامد و ساکت کھڑا رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ میں قاہرہ میں بھی خطاطی کے بہترین نمونے دیکھ چکا ہوں، لیکن اس فن میں جو کمال میں نے یہاں دیکھا ہے وہ مجھے کہیں اور نظر نہیں آیا۔

مجھے ابھی اور بہت کچھ دیکھنا تھا، لیکن وقت کی تنگی کے باعث میری حالت اس شخص کی تھی، جو ایک تیز رفتار گاڑی میں بیٹھا تیزی سے گزرتے ہوئے دلفریب مناظر دیکھ رہا ہو۔

ایک بجے کے قریب ہم باسفورس کے مغربی کنارے شمال کا رخ

کر رہے تھے اور ہمارے دونوں اطراف پہاڑیوں اور ٹیلوں کی تدریجی ڈھلوانیں دلکش مناظر پیش کر رہی تھیں۔ کوئی تیس چالیس منٹ بعد ہم بحیرۂ اسود کے قریب ایک خوبصورت ریسٹورنٹ میں رکے اور وہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس ریسٹورنٹ کا بہترین کھانا مچھلی تھا۔ باسفورس میں بحیرۂ اسود سے لے کر بحیرۂ روم کے پانیوں کی مچھلیوں کی تمام اقسام ملتی ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سردیوں کے موسم میں بحیرۂ اسود کی مچھلیاں جنوب کی طرف بحیرۂ روم کا رخ کرتی ہیں اور گرمیوں کے موسم میں بحیرۂ روم کی مچھلیاں نسبتاً سرد پانی کی تلاش میں بحیرۂ اسود کی طرف چل پڑتی ہیں اور ان کے دونوں اطراف کے قافلوں کو باسفورس سے گزرنا پڑتا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم وہاں سے لوٹے۔ اب ہماری منزل وہ قلعہ تھا، جس کے بلند برج کے ایک کونے میں بیٹھ کر سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ کی تسخیر کا وہ پلان تیار کیا تھا، جسے دنیا بھر کی فوجی تاریخ کا ایک محیر العقول کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

آج سے دس سال قبل جب میں نے سلطان محمد فاتح کی فتح کو ایک ناول کا موضوع بنانے کا ارادہ کیا تھا تو مجھے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے بذاتِ خود قسطنطنیہ کا محلِ وقوع دیکھنا چاہیے کیونکہ صرف کتابوں کی مدد سے اُن مشکلات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل معلوم ہوتا تھا جو قسطنطنیہ کے فاتح کے راستے میں حائل تھیں۔ اپنی نئی تصنیف "قیصر و کسریٰ" کے پورے تاریخی پس منظر کا مطالعہ کرتے وقت بھی میں نے ہرقل کے دارالحکومت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ قارئین کے لیے اس قلعے کا تاریخی پس منظر دلچسپی سے خالی نہیں

ہوگا، جیسے سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کی فتح کے لیے تعمیر کیا تھا۔

قسطنطنیہ کی تسخیر عالمِ اسلام کا ایک دیرینہ خواب تھا اور چونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قسطنطنیہ کے فاتح کو جنتی ہونے کی بشارت دی تھی، اس لیے عالمِ اسلام کے کئی اولوالعزم سپاہی اس شہر پر قوت آزمائی کر چکے تھے۔ بازنطینی حکمرانوں کا یہ عقیدہ تھا کہ یورپ اور ایشیا کے درمیان عیسائیت کا یہ دفاعی حصار ناقابلِ تسخیر ہے اور اس یقین کی بڑی وجہ قسطنطنیہ کا جغرافیائی محلِ وقوع تھا۔

جیسا کہ اس سے قبل لکھا جا چکا ہے، قسطنطنیہ کے جنوب اور مشرق کی سمت بحیرۂ مارمورا اور آبنائے باسفورس ایشیا کی طرف سے پیش قدمی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔

مسلمانوں سے پہلے مشرق سے مغرب کی طرف رُخ کرنے والے تمام فاتحین آبنائے باسفورس، بحیرۂ مارمورا یا اس سے نیچے درہ دانیال کے کنارے آکر رُک جاتے تھے۔ خسرو پرویز، جس نے رومائی ساری سلطنت کو تہ و بالا کر دیا تھا، قسطنطنیہ کے سامنے باسفورس کے کنارے اٹھارہ سال تک پڑاؤ ڈال کر اس شہر کو فتح کرنے کے خواب دیکھتا رہا، لیکن اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

اس کے بعد مسلمانوں نے جو حملے کیے، ان کی ناکامی کی وجہ بھی یہی تھی کہ قسطنطنیہ یورپ سے ایشیا کو جدا کرنے والی آبی گزرگاہ کے باعث محفوظ تھا۔ ترکوں کے لیے قسطنطنیہ کو فتح کرنا محض شہرت و ناموری کا مسئلہ نہ تھا۔ صلیبی جنگوں کی ہولناکیوں نے قسطنطنیہ کی فتح کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنا دیا تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ جب تک بازنطینی سلطنت کا دارالحکومت فتح نہیں کیا جاتا، یہ مشرق کی طرف مغربی اقوام کی یلغار کے لیے ایک اہم مستقر کا

کام دیتا رہے گا۔ سلطان محمد فاتح کے پیشرو بحیرۂ ایڈریاٹک اور دریائے ڈینیوب کے درمیان وسیع علاقوں پر قبضہ جمانے کے بعد قسطنطنیہ پر طاقت آزمائی کر چکے تھے، لیکن قدرت کی طرف سے اس عظیم فتح کی سعادت سلطان محمد فاتح کے لیے مقدر ہو چکی تھی۔

قسطنطنیہ کی تیسری یعنی شمالی جانب وہ خلیج جسے "گولڈن ہارن" کہا جاتا ہے ایک اور اہم دفاعی حد کا کام دیتی ہے۔ گویا قسطنطنیہ کے تین اطراف پانی تھا۔ صرف مغرب کی سمت ایسی تھی، جدھر سے حملہ ہو سکتا تھا اور اس سمت کو محفوظ بنانے کے لیے ایک ناقابلِ تسخیر دوہری فصیل اور اس کی حفاظت کے لیے ایک وسیع خندق موجود تھی، جس کی گہرائی سو فٹ تھی۔ چنانچہ اس سمت سے دھاوا بول کر قسطنطنیہ کو فتح کرنا بے حد مشکل تھا۔

قسطنطنیہ کی جو اطراف باسفورس، مارمورا اور گولڈن ہارن سے ملتی تھیں، ان کے دوہرے دفاع کے لیے وہاں بھی فصیلیں اور خندقیں بنائی گئی تھیں۔

محمد فاتح کے دادا سلطان مراد اوّل نے باسفورس کے مشرقی یا ایشیائی کنارے پر ایک قلعہ تعمیر کیا تھا، جو آج بھی موجود ہے۔

سلطان محمد فاتح نے اکیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوتے ہی اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عہد کیا تھا، جس میں سلطان مراد اور بایزید جیسے جابر شہنشاہوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ چنانچہ اس نے باسفورس کے دوسرے کنارے یعنی یورپ کی طرف سلطان مراد کے

ایشیائی قلعے کے بالکل سامنے ایک اور قلعہ تعمیر کیا۔ یہ قلعہ بازنطینی دارالحکومت سے کوئی پانچ میل دُور ہے۔ اس کی تکمیل کے بعد بحرِ اسود سے باسفورس کے راستے قسطنطنیہ کے لیے رسد اور کمک لانے والے جہازوں کا راستہ مسدود ہو چکا تھا، تاہم جنوب کی طرف بحیرۂ مارمورا سے آنے والے جہازوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ سلطان محمد فاتح کے حملہ سے قبل قسطنطنیہ پر سمندر کے راستے جتنے حملے ہوئے تھے، ان کی ناکامی کی بڑی وجوہ تین تھیں: اوّلاً یہ کہ گولڈن ہارن (جس کے لیے خلیج کا لفظ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے) اور باسفورس کی آبی گزرگاہوں کی حفاظت کے لیے بازنطینی حکمرانوں کے پاس ایک مضبوط بحری بیڑا موجود تھا۔ ان جنگی جہازوں پر بڑے بڑے منجنیق نصب تھے، جن کی مدد سے حملہ آور بیڑے پر آتشیں گولے پھینکے جاتے تھے۔ یہ آتشیں گولے جنھیں گریک فائر (GREEK FIRE) یا شعلۂ یونان کا نام دیا جاتا ہے، توپ کی ایجاد تک اہلِ روم کا ایک انتہائی موثر ہتھیار تھا۔ بالخصوص بحری جنگوں میں یہ حربہ انتہائی کارگر ثابت ہوتا تھا۔

دوسرا یہ کہ خلیج کے ناکے پر اپنی بندرگاہ کو بچانے کے لیے باسفورس کے تنگ مقامات پر بڑی بڑی آہنی زنجیریں ڈال رکھی تھیں، تاکہ اگر ان کا بحری بیڑا شکست کھا جائے تو یہ زنجیریں دُشمن کے جہاز کو بندرگاہ کی جانب بڑھنے سے روک سکیں، اور ثالثاً یہ کہ جنگی جہازوں کی طرح فصیلوں پر آتشیں گولے پھینکنے والے منجنیق نصب تھے۔

محمد فاتح کے زمانے میں توپوں کی ایجاد نے قسطنطنیہ کے دفاعی استحکامات میں اور زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ سلطان کے پیشرو کئی بار

جہازوں کی مدد سے قسطنطنیہ پر حملہ کر چکے تھے اور محمد فاتح خود بھی اپنے جنگی بیڑے کی مدد سے قسطنطنیہ پر دھاوا بول کر سخت نقصان اُٹھا چکا تھا۔

اس ناکامی کے بعد سلطان محمد فاتح نے پوری قوت کے ساتھ خشکی کی طرف سے حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ قسطنطنیہ کی دیواریں توڑنے کے لیے ایڈریانوپل میں جو نئی توپیں تیار کی گئیں، ان میں سے بعض اتنی بڑی تھیں کہ وہ چھ سو پاؤنڈ کا پتھر پھینک سکتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان توپوں کو ڈھالنے کے لیے ہنگری کے ایک کاری گر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، جس نے اپنا وطن چھوڑ کر محمد فاتح کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ان توپوں کی مدد سے کچھ عرصہ شہر پناہ پر گولہ باری کرنے کے بعد ترک افواج آگے بڑھیں اور خندق کے قریب پہنچ گئیں۔ فصیل سے یونانیوں کی گولہ باری بھی شدید تھی اور حملہ آوروں کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ اس وسیع خندق کو عبور کرنے کے لیے گزرگاہ بنانا تھا، چنانچہ انھوں نے پتھر اور مٹی کے علاوہ آس پاس کے درخت کاٹ کر خندق میں پھینکنے شروع کر دیے، لیکن فصیل پر سے تیروں اور گولوں کی بے پناہ بارش میں اس خندق کو عبور کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ خشکی کی طرف سے حملہ کے دوران میں سلطان محمد نے سمندر کی طرف سے اہلِ قسطنطنیہ کی رسد اور کمک کے راستے بند کر رکھے تھے اور اُسے یہ اُمید تھی کہ رسد و بارُود کی کمی کے باعث اہلِ قسطنطنیہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکیں گے۔

لیکن محاصرہ سے ایک ماہ بعد یورپ سے بازنطینی حکمرانوں کے مغربی حلیفوں کا جنگی بیڑا جو دُور تک مار کرنے والے آتشیں اسلحہ سے مسلح تھا، رسد اور اسلحہ کی ایک بڑی مقدار لے کر قسطنطنیہ کی بندرگاہ تک پہنچ گیا، اور سلطان کے جہاز شدید مزاحمت کے باوجود راستہ نہ روک سکے۔

اپنے مغربی حلیفوں سے رسد و بارود حاصل کرنے کے بعد رومیوں کے حوصلے تازہ ہو گئے۔ سلطان محمد فاتح نے اپنے بحری بیڑے کی اس ناکامی سے پریشان ہو کر قسطنطنیہ پر ایک زوردار حملہ کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن اس سے کامیابی نہ ہوئی۔

اہلِ قسطنطنیہ شہر کی تین اطراف قطعاً محفوظ سمجھ کر اپنی قوت مغربی دیوار کی حفاظت پر صرف کر رہے تھے۔

اس آخری حملے کی ناکامی کے بعد سلطان کے لیے پھر ایک بار سب سے بڑا مسئلہ قسطنطنیہ کی بندرگاہ پر قبضہ کرنا تھا، جہاں سے سمندر کے راستے انھیں مدد پہنچ رہی تھی، کیونکہ اسی صورت میں وہ ایک طرف قسطنطنیہ کی مکمل ناکہ بندی کر سکتا تھا اور دوسری طرف اہلِ شہر کی توجہ دو محاذوں پر مبذول کرا سکتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جب سلطان کے سپاہی دن بھر کی تھکاوٹ سے چور ہو جاتے تھے تو وہ تنہا کبھی اس قلعے کے ایک کمرے میں بیٹھ کر، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور کبھی کیمپ میں اپنے خیمے کے اردگرد چکر لگاتے وقت قسطنطنیہ کی فتح کے نئے نئے پلان سوچا کرتا تھا اور اس وقت جبکہ رومیوں کو اس بات کا اطمینان ہو چکا تھا کہ اب سلطان کے لیے شہر کا محاصرہ اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا، یہ اولوالعزم سپاہی اپنے ایک ناقابلِ یقین جنگی منصوبے کو بروئے کار لانے کی تیاریاں کر چکا تھا۔

سلطان کے جہازوں کی ایک خاصی تعداد قسطنطنیہ کی بندرگاہ سے چند میل اوپر باسفورس میں موجود تھی اور باسفورس کے راستے ان کشتیوں کو نیچے لا کر بندرگاہ پر حملہ کرنے میں جو دشواریاں تھیں، ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

سلطان کو ان مشکلات پر قابو پانے کی ایک ہی صورت نظر آئی اور وہ یہ تھی کہ جنگی بیڑے کے ہلکے جہاز اور کشتیاں باسفورس سے نکال لیے جائیں اور انھیں خشکی کے راستے چند میل دھکیل کر شہر کے شمال مغربی کونے کے قریب خلیج (گولڈن ہارن) میں ڈال دیا جائے۔ سلطان کو اس سے دو فائدوں کی توقع تھی۔ اولاً یہ کہ پانی کے راستے ان جہازوں کو باسفورس سے خلیج تک پہنچانے کی مشکلات دور ہو جاتی تھیں، ثانیاً یہ کہ اس جگہ یعنی شہر کے شمال مغربی کونے کے قریب خلیج کا پانی نسبتاً کم گہرا تھا اور رومیوں کے بڑے جنگی جہاز جو باسفورس اور خلیج (گولڈن ہارن) کے مقامِ اتصال کے قریب بندرگاہ کی حفاظت کے لیے کھڑے تھے، یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

استنبول میں اپنے قیام کے آخری دن میں نے خاص طور پر خلیج کے مغربی سرے اور باسفورس کے درمیان وہ علاقہ دیکھا تھا، جہاں سے یہ کشتیاں لائی گئی تھیں۔ ہموار زمین پر کشتیوں کو دھکیلنا شاید اتنا مشکل نہ ہو، لیکن ٹیلوں اور وادیوں میں جہازوں کو دھکیل کر دس میل دور لے جانا یقیناً جنگی تاریخ کا ناقابلِ یقین کارنامہ معلوم ہوتا تھا۔ ترکوں نے دس میل کی اس ناہموار گزرگاہ پر لکڑی کے مضبوط تختے بچھا دیے تھے اور ان پر چربی اور تیل کی ایک تہہ بچھا دی گئی تھی، تاکہ جہاز پھسل سکیں۔ جہازوں کو کھینچتے وقت ہوائی طاقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے بادبان بھی کھول دیے گئے تھے۔

مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے سلطان کتنے عرصے سے ضروری ساز و سامان تیار کر رہا تھا، تاہم جہازوں کو خشکی کے راستے لانے کے لیے انتہائی رازداری سے کام لینا ضروری

تھا اور یہ روایت قطعاً مبالغہ آمیز معلوم نہیں ہوتی کہ دس میل کا یہ فاصلہ ایک ہی رات میں طے کیا گیا تھا۔ جہازوں کے آگے تختوں کی گزرگاہ تیار کرنے اور ان پر چربی اور تیل ڈالنے اور جہازوں کو کھینچنے کا کام ایک ہی وقت میں ہو رہا تھا۔ یہ جہاز خلیج کے اس حصّے میں ڈال دیے گئے جہاں پانی کم گہرا تھا اور رومیوں کے بھاری جہاز جو بندرگاہ کی حفاظت پر مامور تھے، وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔

خلیج یعنی گولڈن ہارن پر قبضہ جماتے ہی سلطان نے لکڑی کا ایک طویل و عریض پلیٹ فارم پانی میں ڈال دیا اور اس پر بڑی توپیں نصب کر کے اُسے دوسرے کنارے کی طرف دھکیل دیا، تاکہ شہر پناہ اچھی طرح اس کی گولہ باری کی زد میں آجائے۔ اس کے ساتھ ہی چند دستوں نے خلیج عبور کر کے شہر پناہ پر دھاوا بول دیا۔ پھر جس روز سلطان کی کشتیاں خلیج میں داخل ہوئیں، اسی دن سلطان کی باقی فوج نے پوری شدت کے ساتھ خشکی کی طرف سے حملہ کر دیا۔ بازنطینی فوج، جو پہلے ہی سلطان کے اس ناقابلِ یقین کارنامے سے بدحواس ہو چکی تھی، دو محاذوں پر زیادہ عرصہ مقابلہ نہ کر سکی۔ ان کا صدیوں کا یہ یقین کہ قسطنطنیہ ناقابلِ تسخیر ہے، متزلزل ہو چکا تھا۔ ان کے اضطراب کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے دو سو ساٹھ مسلمان جنگی قیدیوں کے سر کاٹ کر دیوار سے نیچے پھینک دیے — قسطنطنیہ پر فیصلہ کن یلغار کے وقت ان کے بیشتر سپاہی اور افسر سینٹ صوفیا کے گرجے میں جمع ہو کر کسی معجزے کے لیے دُعائیں مانگ رہے تھے۔

یہ فتح ایک قلعے یا ایک شہر کی تسخیر نہ تھی، بلکہ اس سلطنت پر

ایک فیصلہ کن ضرب تھی، جس کے عروج کا ہر دَور اقوامِ مشرق کے لیے آگ اور خون کے ایک نئے سیلاب کا پیغام ہوا کرتا تھا اور اس سیلاب کی ابتدائی لہریں سب سے پہلے ترکوں کو متاثر کیا کرتی تھیں۔ قسطنطنیہ جو ایشیا کی طرف اقوامِ مغرب کی یلغار کے لیے ایک ابتدائی مستقر کا کام دیا کرتا تھا، اب یورپ کی طرف ترکوں کی پہلی منزل بن چکا تھا اور اب اس کا نام اسلامبول یا استنبول تھا۔

جب میں گولڈن ہارن کے کنارے کھڑا ہو کر ان پہاڑوں اور وادیوں کا منظر دیکھ رہا تھا، جہاں سے سلطان محمدؒ کی فوج کشتیاں کھینچ کر لائی تھی، تو میرے لیے یہ سمجھنا مُشکل نہ تھا کہ جب شہر کے اس حصّے کی فصیل کے محافظوں نے اچانک آخری ٹیلے کی چوٹی پر جہاز دیکھے ہوں گے، تو اُن کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔

اب میں اس قلعے کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہُوں، جس کا ذکر کرتے ہوئے مجھے یہ تاریخی داستان بیان کرنی پڑی۔

یہ قلعہ ایک بلند ٹیلے پر واقع ہے اور باسفورس کی طرف اس کا تدریجی ڈھلوان ایک دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ موجودہ صورت میں اس کا اہم ترین حصّہ وہ بُرج ہے جہاں سُلطان محمدؒ کے زمانے کی یادگاریں موجُود ہیں۔ یہ بُرج کوئی ۷۵ میٹر اونچا ہے اور اس کی مُختلف منازل میں کئی حجرے اور کمرے ہیں۔ ایک کمرے میں ایک کشادہ میز پر قسطنطنیہ کی فتح کے لیے سلطان محمدؒ کے جنگی پلان کا نقشہ بنا ہُوا ہے اور فرش پر اس بھاری زنجیر کے ٹکڑے پڑے ہُوئے ہیں جسے رومی باسفورس کا راستہ بند کرنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ دوسرے کمرے میں اس زمانے کے

سپاہیوں کی زرہوں، خودوں، تلواروں اور نیزوں کے نمونے رکھے ہوئے ہیں۔ اسی بُرج میں وہ حجرہ ہے، جہاں سُلطان محمد فاتح کبھی تنہائی میں بیٹھا کرتے تھے اور کبھی اپنے جرنیلوں کے ساتھ جنگ کے متعلق صلاح ومشورہ کیا کرتے تھے۔ بُرج کی چھت پر پہنچ کر دُور دُور تک استنبول کے دِل کش مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

(۱۰)

ترکی کو الوداع

اگلے دن مولانا محمد سعید اور دوسرے ساتھیوں کو انقرہ کے راستے بیروت جانا تھا، اس لیے وہ صبح کے وقت روانہ ہو گئے۔ میں اپنی سیٹ پان امریکن ایرویز کے ہوائی جہاز پر ریزرو کروا چکا تھا، جو آدھی رات کے وقت براہِ راست بیروت کی طرف پرواز کرتا تھا، اس لیے میں ایک دن اور استنبول کی سیر کر سکتا تھا۔ استنبول میں میری دلچسپی کے اتنے سامان تھے کہ اگر میں وہاں چند دن اور ٹھہرتا، تو بھی اس عظیم شہر کو جی بھر کر دیکھنے کی خواہش پوری نہ ہوتی، لیکن خاکِ حجاز کی کشش ایسی تھی کہ مجھے ہر لمحہ صبر آزما محسوس ہوتا تھا۔

صبح اُٹھتے ہی میں نے جدید شہر کی سیر کی، جس کی گلیاں اور بازار دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں یورپ کے کسی شہر میں پھر رہا ہوں۔ جدید ترین عمارتوں میں سے ہلٹن ہوٹل کی عمارت بہت شان دار ہے۔

کوئی ایک بجے کے قریب میں نے محکمۂ سیاحت سے ایک نوجوان کو ساتھ لیا اور دوبارہ قدیم شہر کی طرف چل دیا۔ میری پہلی منزل حضرت

ابوایوب انصاریؓ کا مزار تھا۔ میں نے ساتھ ہی مسجد میں ظہر کی نماز اور دُعا کے بعد میزبانِ رسولؐ کو الوداعی سلام کیا اور دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ مجھے معلوم نہیں اُس وقت میرے تاثّرات کیا تھے، صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرا وہاں سے ہلنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

مطلع صاف تھا اور ہوا کافی سرد تھی۔ مزار کے ساتھ ہی چنار کے ایک پُرانے درخت کے پتّے ایک ایک کرکے گر رہے تھے۔ دو خشک پتّے میرے سامنے گرے اور میں نے اُٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیے۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہُوا مزار کے احاطے سے باہر نکل آیا۔ اس کے بعد میں نے ڈرائیور کو گولڈن ہارن یا اس خلیج کے کنارے کنارے چلنے کے لیے کہا، جس کا تفصیلی ذکر قسطنطنیہ کے ضمن میں آچکا ہے۔ ایک بلند ٹیلے کے قریب پہنچ کر گائیڈ نے بتایا کہ خشکی کے راستے سلطان محمد فاتح جو کشتیاں لائے تھے، وہ تقریباً اس جگہ گولڈن ہارن میں ڈالی گئی تھیں۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے لیے کار سے اُتر کر اس ٹیلے کی چوٹی کا رُخ کیا۔ خلیج کی طرف تدریجی ڈھلوان پر ایک وسیع قبرستان تھا۔ قبروں میں کتبے عربی میں لکھے ہُوئے تھے۔ مردوں کی قبروں کی تختیوں پر کلاہ یا دستار کے نشان تھے اور خواتین کی قبروں کی تختیوں پر پھولوں کے نشان بنے ہُوئے تھے۔

میں انتہائی خوب صورت نسخ اور نستعلیق میں لکھے ہُوئے کتبے پڑھ رہا تھا اور میرا ترک رہنما حیران ہو کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپ یہ کتبے پڑھ سکتے ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "اس میں حیران ہونے کی کونسی

بات ہے۔ پاکستان کا کوئی تعلیمیافتہ آدمی اس رسم الخط سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔"

اُس نے کہا "ہماری نئی پود عربی رسم الخط سے ناآشنا ہے۔ ہم اتاترک کے دور میں رومن رسم الخط اختیار کر چکے ہیں، لیکن اب موجودہ حکومت عربی مدارس کھول رہی ہے اور لوگوں میں اپنا پُرانا رسم الخط سیکھنے کا شوق پیدا ہو رہا ہے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ میں نے تفصیلاً سلجوقی اور عثمانی ترکوں کی فتوحات کا ذکر کیا اور پھر اپنے ساتھی سے کہا: "کسی قوم کے لیے اس سے بڑا ظلم کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ اسے اپنے پُرشکوہ اور قابلِ فخر ماضی سے الگ کر دیا جائے۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کمال اتاترک سے یہ کہتا ـــــ خدارا! مجھے اپنے ماضی سے جُدا نہ کرو۔ ترکوں کے عزم و ہمّت، اسلام کے لیے اُن کی بے مثال قربانیاں اور مشرق و مغرب کی رزمگاہوں میں ان کی شاندار فتوحات کی داستانیں میری میراث ہیں۔ مجھے اپنے قابلِ فخر ماضی سے جُدا کرکے اُس راستے پر نہ ڈالو کہ عالمِ اسلام سے میرے صدیوں کے رشتے منقطع ہو جائیں اور اہلِ مغرب بھی مجھے ایک سیاسی یتیم سے زیادہ حیثیت نہ دیں۔"

گفتگو کے دوران میرا ترک ساتھی کچھ دیر حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر اچانک اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

اس پہاڑی یا ٹیلے کی چوٹی پر خلیج کے دونوں اطراف دلکش مناظر دیکھنے کے بعد میں نے قدیم شہر کی بازنطینی حدود کے گرد چکر لگایا۔ بعض مقامات پر اس شکستہ فصیل کے کچھ آثار باقی ہیں، جسے صدیوں تک ناقابلِ تسخیر

سمجھا گیا تھا اور وہ دروازہ جس سے سلطان محمد ثانی پہلی بار ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا تھا' اب بھی موجود ہے۔ اس دروازے کے ساتھ شکستہ فصیل کا کچھ حصہ بھی موجود ہے' جسے دیکھ کر اس کی بلندی اور وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دیوار سے باہر وہ جگہ جہاں خندق ہو سکتی تھی' اب تقریباً ہموار ہو چکی ہے۔ دروازے کے نزدیک ہی ایک خوب صورت مسجد ہے' جسے سلطان سلیمان عالی شان کی دختر مہر ماہ نے تعمیر کرایا تھا۔

پرانے شہر کی سیاحت سے فارغ ہو کر مارمورا اور باسفورس کے کنارے چکر لگانے کے بعد میں اپنے ہوٹل پہنچا تو رات ہو چکی تھی اور میرے خیالات اپنے سفر کی اگلی منازل کی طرف مرکوز ہو چکے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے سفر کی تیاری شروع کر دی اور کوئی گیارہ بجے کے قریب میرا گائیڈ مجھے ہوائی اڈے تک پہنچانے کے لیے آ گیا اور تقریباً سوا گھنٹے بعد میں اس شہر کو الوداع کہہ رہا تھا' جو اپنے ماضی کی تاریخ' اپنی جدید اور قدیم عمارات' اور اپنے قدرتی مناظر کے لحاظ سے دنیا کا حسین ترین شہر ہے۔

ترکی میں میرا قیام بہت مختصر تھا اور میری سیر و سیاحت بھی اتنی محدود تھی کہ میں اس کے متعلق بہت کچھ جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا' لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اپنے مختصر سے سفر اور محدود سی معلومات کے بعد مجھے ترکی کے حال اور مستقبل کے متعلق وہ اندیشے پریشان نہیں کرتے' جو پاکستان سے روانہ ہوتے وقت میرے ذہن میں موجود تھے۔ ترک ایک زندہ قوم ہیں اور کوئی قوم اپنی اعلیٰ خصوصیات سے دست کش ہونا پسند نہیں کرتی۔ ربع صدی قبل مغرب کی طرف ان کا جھکاؤ بعض افسوس ناک حالات کا منطقی

نتیجہ تھا اور یہ حالات ان سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کی غلط اندیشیوں کا نتیجہ تھے' جو وقت کی رفتار کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ لوگ جو اسلام کی روح اجتہاد سے کام لے کر ترکوں کی فکری و نظری رہنمائی کر سکتے تھے' ایک ایسی حکومت کے آلہ کار بن گئے تھے' جو ہر آن ایک با وقار قوم کو پستی کی طرف دھکیل رہی تھی۔

مغرب کی سامراجی طاقتیں ان کے خلاف متحد ہو چکی تھیں اور مشرق کے عرب ممالک جن کے دشمنوں کا ہر وار ترکوں نے اپنے سینے پر روکا تھا' موت و حیات کی اس کش مکش میں ان کا ساتھ دینے کی بجائے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے آلہ کار بن چکے تھے۔

تن تنہا اپنی آزادی اور بقا کی جنگ لڑنے کے بعد ترکوں کا ردِعمل یہ تھا کہ ان کی آزادی و بقا کا دارومدار ان کی اپنی قوت پر ہے اور یہ قوت حاصل کرنے کے لیے انھیں مادی ترقی کے ہر میدان میں اقوامِ یورپ کی تقلید کی ضرورت ہے۔ پھر جس قدر انھوں نے اپنی جنگِ آزادی کے دوران میں تلخیاں برداشت کی تھیں' اسی قدر یہ عمل شدید تھا۔ تاہم ان تمام باتوں کے باوجود ترک مغرب کے نقال نہیں بن سکے۔ اضطراری حالت میں مغرب کی طرف چند قدم دوڑنے کے باوجود مشرق کے ساتھ ان کے تاریخی اور روحانی رشتے منقطع نہیں ہو سکے۔ آج ان رشتوں کو از سرِ نو زندہ کیا جا رہا ہے اور میرے خیال میں یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ترک مجموعی طور پر اسلام سے بہت دور چلے گئے تھے۔ عربی زبان میں اذان دینے کے خلاف کسی زمانے میں جو تحریک اٹھی تھی' اس کے اثرات چند بڑے شہروں تک محدود تھے' لیکن اب اسی شدت کے ساتھ اس تحریک کا ردِعمل شروع ہو چکا ہے۔

اب دیہات کی طرح استنبول میں بھی عربی میں اذانیں سُنائی دیتی ہیں۔ اب ہر مسجد نمازیوں سے پُر ہوتی ہے۔ اسلام ترکوں کی رُوح ہے اور ایک تندرست و توانا جسم اپنی رُوح سے بے اعتنا نہیں ہوسکتا۔

(۱۱)

ترکی سے میری واپسی کے سات ماہ بعد وہاں ایک سیاسی انقلاب آچکا ہے۔ فوج نے ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا ہے۔ صدر جلال بایار، وزیرِ اعظم عدنان مندریس اور اُن کی پارٹی کے اکثر ارکان گرفتار کرلیے گئے ہیں۔ سابقہ حکومت کے کئی گورنر اور عہدہ دار سبکدوش کردیے گئے ہیں اور ان کی جگہ نئے آدمیوں کا تقرر عمل میں لایا جارہا ہے۔

انقلابی حکومت کے سربراہ جنرل جمال گرسل نے ملک کی زمامِ کار سنبھالتے ہی یہ اعلان کیا تھا کہ فوج جلد از جلد انتخابات کرائے گی اور ترکی کی حکومت جیتنے والی پارٹی کو دی جائے گی۔ یہ اعلان ترکی کے بہی خواہوں کے لیے کافی حوصلہ افزا تھا، لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلابی حکومت کا دائرہ عمل کافی وسیع ہوچکا ہے اور جنرل گرسل کے سامنے وقت کا اہم ترین مسئلہ ترک عوام کے ذہنوں سے عدنان مندریس کی پارٹی کے اثرات زائل کرنا ہے اور اس مقصد کے لیے وہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔

انقلابی حکومت کا عدنان مندریس کے خلاف سنگین ترین الزام یہ تھا کہ وہ شہری آزادیوں کے بدترین دشمن تھے۔ انھوں نے اپنے مخالفین

کو دبانے کے لیے پریس اور پلیٹ فارم پر ایسی پابندیاں عاید کر رکھی تھیں، جن کا کسی جمہوری ملک میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔ حزبِ مخالف کے بیشتر اخبارات بند کر دیے گئے تھے اور ان کے ایڈیٹر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔

ترکی میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کے پیشِ نظر مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامّل نہیں کہ حزبِ مخالف کے ساتھ عدنان مندریس کا رویّہ انتہائی غیر دانش مندانہ تھا۔ وہ ایک ایسی پارٹی کے لیڈر تھے جسے ترک عوام کی بھاری اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ نیشنل اسمبلی کے اندر بھی ان کی اکثریت تھی اور وہ اپنے مخالفین کو دبانے یا مرعوب کرنے کے لیے اوچھے ہتھیار استعمال کیے بغیر برسرِ اقتدار رہ سکتے تھے۔ ایک جمہوری نظام کو چلانے کے لیے حزبِ مخالف اور حزبِ اقتدار دونوں یکساں ضروری ہیں، لیکن عدنان مندریس میں یہ کمزوری تھی کہ ان کے کان حزبِ مخالف کی آواز سننے کے عادی نہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ترکی کی فلاح و بہبود کے لیے جو کام وہ کر رہے ہیں، وہ کسی اور نے نہیں کیا۔ اسی لیے کسی کو ان پر نکتہ چینی کا حق نہیں پہنچتا۔ اور یہی بات ترکی کے اس مردِ آہن کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اگر کسی ملک کو انتشار پسند اور وطن دشمن عناصر کی سرگرمیوں سے کوئی خطرہ ہو تو پریس اور پلیٹ فارم پر بعض قیود کے لیے کوئی وجہِ جواز ہو سکتی ہے، لیکن عدنان مندریس ایک ایسے ملک کے وزیرِ اعظم تھے، جس کے عوام اپنی حب الوطنی کے لیے مشہور ہیں۔ وطن سے غدّاری اور قوم کے اجتماعی مفاد سے بے حسی غیور اور بہادر ترکوں کی روایات کے منافی ہے۔ روس کے قریب ترین ہمسایہ ممالک میں سے صرف یہی ایک ایسا ملک ہے، جس کے عوام کے سامنے

اشتراکیت کے کسی ایجنٹ کو سر اُٹھانے کا موقع نہیں ملا، اور یہی ایک ایسی قوم ہے، جس کی صفوں میں سیاست کے نام پر وطن کی عزت اور آزادی کا سودا کرنے والوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اگر عدنان مندریس رواداری سے کام لیتے تو وہ قوم اور وطن کے حق میں بہتر نتائج پیدا کر سکتے تھے، لیکن جن لوگوں نے قریب سے ترکی کے حالات کا مطالعہ کیا ہے، وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے کہ ترکی کے موجودہ انقلاب کی تمام تر ذمہ داری عدنان مندریس پر عاید ہوتی ہے یا ڈیموکریٹک پارٹی نے شہری آزادیاں سلب کر کے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ فوج کے لیے ملک کے اقتدار پر قبضہ کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں چند اور باتیں ایسی ہیں، جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

عدنان مندریس کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے عصمت انونو جدید ترکی کے معمار کمال اتاترک کے مسلک پر کاربند تھے۔ اتاترک نے دین کو سیاست سے جُدا کیا تھا اور عربی زبان کو جو ہر وقت ترکی میں اسلام کے احیا کا ذریعہ بن سکتی تھی، ملک بدر کر دیا تھا۔ ترک دانشوروں کا وہ طبقہ جو اقوامِ مغرب کی مادی ترقی سے مرعوب تھا، ترکی کو لادینی ریاست بنانے کا پُر زور حامی تھا، لیکن سیکولرازم کی یہ تحریک اس قوم کی نفی تھی، جس کے ماضی کی داستان مسلمانوں کے جاہ و جلال کی داستان تھی۔ ترکی کی بہت بڑی اکثریت استنبول، انقرہ، ازمیر اور چند دُوسرے بڑے شہروں کے مغرب پسند دانشوروں کے اثرات سے آزاد تھی اور انھیں اپنی خواہشات کے سامنے جھکانے میں اتاترک کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اس دَور کے ہیرو تھے، جب کہ عثمانی خاندان کے آخری حکمران کی بے تدبیری اور کمزوری نے قوم کو تباہی کے آخری

کنارے پہنچا دیا تھا۔ جنگِ آزادی میں اتاترک کا ساتھ دینے والے ان علما سے بے زار ہو چکے تھے، جنھوں نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ عربوں کے افسوس ناک طرزِ عمل نے بعض اسلام پسند طبقوں میں بھی علیحدگی پسندی کا رجحان پیدا کر دیا تھا۔

اتاترک نے ان حالات سے پورا فائدہ اُٹھایا اور ملک پہ ایک ایسا آئین نافذ کر دیا، جو عام حالات میں ترکوں کے لیے یقیناً قابلِ قبول نہ ہوتا اور جب تک ترکی کی زمامِ کار اُن کے ہاتھ میں رہی، کسی کو لادینیت کی مہم کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اقوامِ مغرب جو ترکوں کی اسلام پسندی کو اپنے لیے ایک مستقل خطرہ سمجھتی تھیں اور جنھوں نے میدانِ جنگ میں اتاترک کے ہاتھوں عبرت ناک شکست کھائی تھی، اب ترکی میں لادینیت کے فروغ کو اپنے لیے ایک نیک فال سمجھتے تھے۔ عالمِ اسلام کے یہ محافظ جو صدیوں سے مغربی سامراجیوں کے عزائم خاک میں ملاتے آرہے تھے، اپنے دین سے بددل ہو جانے اور ہمسایہ اسلامی ممالک سے کٹ جانے کے بعد ان کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتے تھے۔ اب ممالکِ عرب یتیم ہو کر رہ گئے تھے۔ اب تیل کے چشموں کی حفاظت کے لیے وہاں سازشوں کے جال پھیلائے جا سکتے تھے۔ اب شمالی افریقہ کی ریاستوں میں خون کی ہولی کھیلی جا سکتی تھی اور فلسطین میں صیہونیت کا جھنڈا گاڑنے کے لیے لاکھوں عربوں کو جلاوطن کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مغربی پریس نے پوری فیاضی کے ساتھ اتاترک کے اقدامات کی حمایت کی اور وہ مردِ بیمار جسے چند برس قبل برطانیہ، فرانس اور ان کے دوسرے اتحادی یورپ کی حدود سے باہر نکال دینے پر متفق ہو چکے تھے، اب ایک نئے دور کا مشعل بردار بن گیا۔ وہ قوم جس کے

"مذہبی جنون" نے انھیں صدیوں تک خوف زدہ رکھا تھا، اب یکایک "روشن خیال" بن گئی، لیکن ترکی میں اس انقلاب کے اثرات جس پر مغرب کی سامراجیت اور صیہونیت کا حامی پریس پھولا نہیں سماتا تھا، ایک بالائی سطح سے نیچے نہ جا سکے۔ ترک پہلے بھی مسلمان تھے اور اب بھی مسلمان ہیں۔ کم از کم دیہات کی اسّی فیصد آبادی پر ان دانشوروں کا کوئی اثر نہ تھا، جنھوں نے اسلام پر رجعت پسندی کا لیبل چسپاں کر کے اپنے حریفوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا تھا۔

اتاترک کے بعد عصمت انونو ان کے جانشین بنے تو دین کے متعلق ان کی پالیسی بھی اتاترک کی پالیسی سے مختلف نہ تھی، لیکن اس کا ماحصل یہ تھا کہ ترکی ایک طرف اپنے ہمسایہ اسلامی ممالک سے کٹ چکا تھا اور دوسری طرف اقوامِ مغرب کی برادری میں بھی اُسے کوئی قابلِ فخر مقام حاصل نہیں ہوا تھا۔ اندرونی حالت یہ تھی کہ اسلام کے حق میں ایک شدید ردِّ عمل شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ آزاد انتخابات میں عصمت انونو کی پارٹی کی شکست کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ ترک عوام قوم کی قیادت کے نئے دعوے داروں کو اتاترک کے جانشینوں کی نسبت زیادہ اسلام پسند خیال کرتے تھے۔

ڈیموکریٹک پارٹی نے اسلام کے احیا کے حق میں جو موقف اختیار کیا تھا، وہ ترک عوام کی بھاری اکثریت کی خواہشات کے عین مطابق تھا۔ مندرلیس وزارت کو اس سلسلہ میں کسی تشدد کی ضرورت نہ تھی۔ عوام کو اپنے دین سے محبت تھی، اس لیے نئی مساجد تعمیر ہونے لگیں اور دینی مدرسے کھلنے لگے۔ وہ ترکی کی بجائے عربی میں اذان سننا پسند کرتے تھے، اس لیے عربی میں اذانیں دی جانے لگیں۔

عدنان مندریس پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ دل سے اسلام کے کچھ زیادہ حامی نہ تھے اور ترکی میں اسلام کے احیار کے لیے ان کی مہم کا مقصد صرف مذہب پسند عوام کی تائید و حمایت حاصل کرنا تھا۔ یعنی انھیں یہ احساس تھا کہ وہ اپنے دین سے محبت رکھتے ہیں اور وہ ان کے جذبات کی تسکین کا سامان مہیا کر کے انھیں اپنے پیچھے لگا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر عدنان مندریس نے مصلحتاً بھی ترکی میں مذہب کے احیار کی مہم شروع کی تھی، تو بھی ان کا یہ اقدام جمہوری اخلاق کے عین مطابق تھا۔

"ایک جمہوری ملک کا وزیر اعظم وہاں کے عوام کی اخلاقی اور رُوحانی قدروں اور تہذیب و روایات کا امین اور محافظ سمجھا جاتا ہے۔ وہ عوام پر جبراً اپنے ذاتی عقاید اور نظریات نہیں ٹھونستا، بلکہ ان کی اپنی خواہشات اور اعتقادات کے دائرے میں ان کے لیے بڑھنے پھُولنے اور پنپنے کے سامان مہیا کرتا ہے۔ اگر عوام مشرق کی طرف جانا چاہیں تو وہ انھیں اقتدار کے لٹھ سے مغرب کی طرف نہیں ہانکتا۔ اگر عوام مذہب پسند یا دیندار ہوں تو وہ انھیں لادینیت کا راستہ نہیں دکھاتا۔"

انتخابات میں ری پبلکن پارٹی کی شکست نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ترک عوام کی بڑی اکثریت اپنا مُستقبل اسلام کے ساتھ وابستہ رکھنا چاہتی ہے اور لادینیت کے حامیوں میں ان کے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی اور مذہب کے متعلق عدنان مندریس کے اقدامات ان لوگوں کی خواہشات کے عین مُطابق تھے، جن کے ووٹوں کے بل بوتے پر وہ ترکی کے وزیر اعظم

بنے تھے۔ ری پبلکن پارٹی کی شکست ان لوگوں کی ناکامی تھی، جو ترکوں کی اکثریت کا مستقبل اپنی خواہشات کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔

پھر ترکی میں اسلام کا احیار، صرف وہاں کے عوام کی جذباتی تسکین کا مسئلہ نہ تھا بلکہ حقیقت پسندی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ترکوں کو اس چٹان سے پھسلنے نہ دیا جائے جس پر پاؤں جما کر انھوں نے صدیوں تک وقت کی مہیب ترین آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے۔ انھیں ایک ایسے دین سے بددل کرنا یقیناً ایک نامسعُود کوشش تھی، جس کی برکات نے انھیں یورپ اور ایشیا کی ایک عظیم ترین قوم بنا دیا تھا۔

یہ بات انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ اگر ایک حکمران پارٹی ترک عوام کی خواہشات کے بالکل برعکس دین کے خلاف محاذ بنا لے اور اس کی عدم رواداری کا یہ عالم ہو کہ عربی میں اذان کی آواز بھی اس کے کانوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو تو حامیانِ مغرب اسے "آزاد خیالی اور ترقی پسندی" کے سرٹیفکیٹ عطا کریں اور دوسری پارٹی عوام کی خواہشات کی تسکین کے لیے مساجد اور مدرسے تعمیر کرے تو اس پر تنگ نظری اور رجعت پسندی کے لیبل چسپاں کر دیے جائیں۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی خارجہ پالیسی بھی ترکی کے سابق حکمرانوں کی نسبت زیادہ حقیقت پسندانہ تھی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد دنیا کے سیاسی حالات نے ہر چھوٹی اور بڑی قوم کو اپنے لیے دوست اور اتحادی تلاش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مختلف بلاکوں یا دھڑوں کے اندر بھی صرف ان ممالک کی اہمیت محسُوس کی جاتی تھی جو دوسروں کا تعاون حاصل کر سکتے تھے اور جدید ترکی کے معماروں نے جو راستہ اختیار کیا تھا، اس کا حاصل یہ تھا کہ ترکی مشرق کے اسلامی ممالک میں اپنا مقام کھو چکا تھا اور مغربی اقوام کی

برادری میں اُسے کوئی قابلِ ذکر مقام حاصل نہ تھا۔ اہلِ مغرب درہ دانیال اور آبنائے باسفورس کے محافظوں کو کمیونزم کے خلاف اپنی دفاعی تنظیموں کا ایک اہم رُکن تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ ترکوں کی شجاعت کی تعریف بھی کرتے ہیں، لیکن قبرص کا جھگڑا اُٹھا ہوتا ہے تو ترکوں کے یہ دوست یونان کو ناراض کرنا پسند نہیں کرتے۔ صدیوں تک عالمِ اسلام کی قیادت کے منصب پر فائز رہنے کے بعد چند سالہ علیحدگی پسندی کے نتائج کے خلاف ترکوں کا ردِّ عمل یہ تھا کہ انھوں نے مشرق کے ساتھ صدیوں کے پُرانے رشتے کو از سرِ نو مستحکم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ ترکی کو اس مقصد کے لیے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہ تھی۔ ترکی کے ساتھ ماضی کے رشتے زندہ کرنے کے لیے پاکستان اور ایران کی گرم جوشی اس امر کا ثبوت تھی کہ اپنے ترک بھائیوں کے لیے بیرونی ممالک کے مسلمانوں کا جذبۂ محبت سرد نہیں ہوا۔ ترکی میں اسلام کے احیاء کے باعث ترکوں اور عربوں کا ایک دوسرے کی طرف مائل ہونا بعید از امکان نہ تھا۔ روحانی رشتے سیاسی رشتوں کے لیے مستحکم بنیادیں فراہم کرسکتے تھے، لیکن عربوں اور ترکوں کے اتحاد کے باعث بین الاقوامی اخوت کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا تھا، مغربی اقوام اسی قدر اسے اپنے مفاد کے خلاف سمجھتی تھیں۔ فلسطین میں صیہونیت کے فتنے کی سرپرستی کرنے والے اور الجزائر میں فرانس کی بربریت کی حمایت کرنے والے مغربی ممالک یہ کیسے گوارا کرسکتے ہیں کہ ترکوں جیسی زندہ اور متحرک قوم مشرقِ وسطیٰ کی سیاست میں ان کی حریف بن جائے۔ ترکوں کو اسلام سے دُور رکھ کر ہی الجزائر میں فرانس اور فلسطین میں یہودیوں کے مفادات کی نگہبانی ہوسکتی تھی۔ چنانچہ مغربی پریس نے پورے شدّومد کے ساتھ مندریس کی حکومت کے

خلاف پروپیگنڈہ کی مہم شروع کر دی۔ بظاہر اس مہم کا مقصد ان جمہوری قدروں کی حمایت تھا، جن کی بقا کے لیے مندریس کی عدم رواداری اور تند مزاجی نے خطرہ پیدا کر دیا تھا، لیکن درحقیقت اس کا مقصد سیکولرزم کے اُن حامیوں کے ہاتھ مضبوط کرنا تھا جو ترکی میں اسلام کے احیاء کے خلاف سینہ سپر ہوسکتے تھے۔

انقلابی حکومت کے قائد جنرل جمال گرسل کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ ترکی میں جمہوریت کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے میدان میں آئے ہیں اور اگر وہ ملک کے پریس اور پلیٹ فارم کو تمام وہ آزادیاں دے سکیں جو مندریس حکومت نے چھین لی تھیں تو ترک عوام بلاشبہ انھیں اپنا محسن خیال کریں گے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ترک عوام کی اکثریت جس قدر جمہوریت پسند ہے، اسی قدر اسلام پسند بھی ثابت ہوگی۔ جنرل گرسل کے اعلان کے مطابق یونیورسٹی کے پروفیسر ترکی کا نیا آئین تیار کر رہے ہیں اور ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ نئے آئین کے خدوخال کیا ہوں گے، بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اس آئین میں ان دانشوروں کی خواہشات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے گا، جو ترکی میں مذہب کے احیا سے پریشان تھے، لیکن مجھے یہ ماننے میں تامّل ہے کہ ترکوں پر اُن کی خواہشات کے خلاف کوئی آئین ٹھونسا جاسکتا ہے۔ اگر جمال گرسل عدنان مندریس سے زیادہ حقیقت پسند ہیں تو انھیں بہرحال ترک عوام کی خواہشات کا احترام کرنا پڑے گا۔ قیادتیں بدلی جاسکتی ہیں، انقلاب لائے جاسکتے ہیں، لیکن ایک زندہ قوم کے لیے صرف ایک ایسی تبدیلی یا انقلاب خیر و برکت کا موجب ہوسکتا ہے، جو اسے اپنی جبلت، اپنی روایات، تہذیب و اخلاق اور رُوحانی قدروں کے دائرے میں بڑھنے پھُولنے اور پنپنے

کے بہترین مواقع مہیا کرتا ہو۔

"ترک قوم کسی حادثے کی پیداوار نہیں۔ اس کا پرشکوہ ماضی صدیوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس نے کئی انقلاب دیکھے ہیں۔ کئی آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اس عظیم قوم کے لیے اپنے پرشکوہ ماضی کی روشنی میں اپنے حال اور مستقبل کی راہیں متعین کرنا دشوار نہ ہوگا۔"

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، ہم ترکوں کو پہلے کی طرح اب بھی اپنا دوست اور بھائی سمجھتے ہیں۔ ترک قوم اور ان کی قیادت کے دعوے داروں کے حق میں ہماری دعائیں ہیں کہ وہ خالق اکبر جس کی مرضی سے قوموں کے عروج و زوال کے راستے متعین ہوتے ہیں، ہمارے قابلِ احترام اور قابلِ فخر دوستوں اور بھائیوں کا حامی و ناصر ہو۔ باری تعالیٰ ترکی کے نئے رہنماؤں کو یہ توفیق دے کہ وہ اپنی قوم کی بلند ترین توقعات پوری کر سکیں اور انھیں ایسے دانش وروں کی گمراہی سے بچائے جو ترکی میں اسلام کے احیا کو اپنی شکست سمجھتے ہیں۔"

(۱۲)

بیروت

رات کے پچھلے پہر پان امریکن ایرویز کا طیارہ بیروت کے ہوائی اڈے پر اترا اور میں تھوڑی دیر بعد شہر کے ایک ہوٹل میں پہنچ گیا۔

رات بھر کی بے خوابی اور تھکاوٹ کے باعث میں بستر پر لیٹ گیا، لیکن تھوڑی دیر بعد کمرے کی کھڑکی کے نیچے انسانوں کا شور سنائی دینے لگا۔ میں نے باہر جھانکا تو معلوم ہوا کہ نیچے فروٹ مارکیٹ ہے اور شہر کے دکان دار وہاں بولیاں دے رہے ہیں۔ میں نے کھڑکیاں بند کر کے دوبارہ سونے کی کوشش کی، لیکن لوگوں کا شور بڑھتا گیا اور مجھے نیند نہ آ سکی۔ اٹھ کر نماز پڑھی اور اس کے بعد ہوٹل کے منتظم سے درخواست کی کہ میرا کمرہ دوسری طرف منتقل کر دیا جائے۔ اس نے جواب دیا "مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن دوسری طرف دن کے وقت آپ کو ٹریفک کا شور پریشان کرے گا۔ اب منڈی کا ہنگامہ ختم ہو گیا ہوگا، اس لیے آپ جا کر سو جائیں۔"

میں مجبوراً دوبارہ آ کر بستر پر لیٹ گیا، جب آنکھ کھلی تو دس بج

چکے تھے۔ میں نے اُٹھ کر پاکستان کے پریس اتاشی مسٹر صلاح الدین خورشید کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔

تھوڑی دیر بعد ناشتے سے فارغ ہوا تو مسٹر ابراہیم یہ پیغام لے کر پہنچ گئے کہ مسٹر خورشید آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ دُبلا پتلا نوجوان ایک فلسطینی مہاجر تھا، جس کے چہرے پر ان دس لاکھ مسلمانوں کی داستان لکھی ہوئی تھی، جو فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے بعد عرب ممالک میں جلاوطنی کے دن گزار رہے ہیں۔

میں ۱۹۵۱ء میں مصر، شام، لبنان اور عراق کی سیاحت کے دوران فلسطینی مہاجروں کے کئی کیمپ دیکھ چکا تھا اور میرے لیے فلسطین کی اس نسل کے آلام و مصائب کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا، جو اپنے سنِ شعور کی ابتدا سے لے کر اب تک غریب الوطنی، بے چارگی اور مفلسی کے دن گزار رہی تھی۔

۱۹۵۱ء میں میرا اندازہ یہ تھا کہ فلسطین کے مہاجر کبھی بھی اپنی حالت پر مطمئن نہ ہو سکیں گے۔ اگر انھیں دُنیا کی تمام آسائشیں مہیا کر دی جائیں تو بھی وہ فلسطین واپس جانے کے لیے بے چین رہیں گے اور آج آٹھ سال بعد اس نوجوان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بھی میں یہی محسوس کر رہا تھا کہ اپنے اُجڑے ہوئے گھروں کو دوبارہ آباد کرنے کے متعلق ان لوگوں کے عزائم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان ذہین اور جفاکش لوگوں کی حالت اب پہلے سے کہیں بہتر ہے، لیکن ان کے نزدیک دنیا کی کوئی آسائش اپنے وطن کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔

یہ احساس کہ وہ عظیم بے انصافی کا شکار ہوئے ہیں، انھیں اس

وقت تک مضطرب اور بے چین رکھے گا، جب تک کہ فلسطین سے صیہونی جارحیت کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ یہ دس لاکھ مہاجر عربوں کے وجود کا ایک زخمی حصّہ ہیں اور جب تک یہ زخم مندمل نہیں ہوگا، عرب بلکہ دُنیائے اسلام کے سارے وجود میں درد کی ٹیسیں اُٹھتی رہیں گی۔ اگر قانونِ قدرت کی نگاہ میں مہاجرینِ فلسطین دائرۂ انسانیت سے خارج نہیں ہیں تو وہ طاقتیں جو فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کو اپنے تدبّر کا کمال سمجھتی تھیں، کسی دن یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گی کہ انھوں نے صرف چند لاکھ فلسطینیوں کو نکال کر ان کی جگہ یہودی آباد نہیں کیے بلکہ پورے مشرقِ وسطیٰ کے خرمنِ امن پر جلتے ہوئے انگارے پھینک دیے ہیں۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ ہر کمزور بے بس اور مظلوم کسی طاقت ور کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور فلسطین کے مہاجر جب اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی نگاہیں عرب جمہوریہ کے اولوالعزم رہنما جمال عبدالناصر پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہیں۔

مسٹر ابراہیم نے جمال عبدالناصر کا ذکر چھیڑا تو اس کی آنکھیں تشکّر کے آنسوؤں سے لبریز نظر آنے لگیں۔ "ناصر میرا باپ ہے"، اس نے محبّت اور محبّت کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا "میں نے انھیں خط لکھا تھا کہ میرے دل میں آپ کی وُہی عزّت ہے، جو ایک بیٹے کے دل میں اپنے باپ کے لیے ہونی چاہیے۔ آپ سوچتے ہوں گے جمہوریہ عرب کے صدر کی نگاہ میں ایک مفلوک الحال فلسطینی مہاجر کی کیا وقعت ہو سکتی ہے، لیکن یہ دیکھیے"، اس نے ایک جیب سے ایک کاغذ نکال کر مجھے پیش کرتے ہوئے کہا:

"یہ اُن کا جواب ہے۔ انھوں نے مجھے اپنا بیٹا کہہ کر مخاطب کیا ہے۔"

عربی زبان میں ٹائپ شدہ خط میں جمال عبدالناصر کے دستخط موجود تھے اور ابراہیم صاحب نے کاغذ کو دوبارہ تہ کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا "مجھے خود بھی اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ میرے خط کا جواب لکھیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ بیحد مصروف آدمی ہیں، لیکن میں فلسطین کا مہاجر ہوں اور وہ ہر فلسطینی مہاجر کی دلجوئی اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ میری دیکھا دیکھی کئی اور دوستوں نے انھیں خط لکھے تھے اور ان سب کو اس قسم کے جواب آ رہے ہیں۔"

میں مسٹر ابراہیم کے ساتھ باتیں کرتا ہوا پاکستانی سفارت خانے کی طرف چل دیا۔ بیروت کی سڑکوں اور بازاروں میں ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ میرا ساتھی انتہائی گرم جوشی کے ساتھ ممالک عرب کی سیاست اور جمال عبدالناصر کی شخصیت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔ گلیاں اور سڑکیں عبور کرتے وقت جب میری توجہ ٹریفک کی طرف مبذول ہو جاتی تو ابراہیم صاحب فوراً ہی مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے اور مجھے بار بار خطرہ محسوس ہوتا کہ ہم دونوں کہیں کسی تیز رفتار موٹر کی زد میں نہ آ جائیں۔ کچھ دیر پیدل چلنے کے بعد ہم ایک ٹیکسی پر بیٹھ گئے۔

سفارت خانے میں مسٹر صلاح الدین خورشید اور ان کے بعد پاکستانی سفیر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میرے ساتھی جو مجھ سے ایک دن پہلے بیروت پہنچ چکے تھے، وہاں موجود تھے۔ یہ حضرات قدرے پریشان نظر آتے تھے۔ میں نے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ جہاز والوں کی غلطی سے ان سب کا سامان انقرہ میں اُتار لیا گیا ہے۔ اگلے دن مجھے مسٹر خورشید نے بتایا کہ یہ سامان دوسرے جہاز سے پہنچ رہا ہے۔

مسٹر خورشید کے دفتر میں پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے بھی ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب حرمین شریفین کی زیارت کے بعد مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کا دورہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے سفر کے دلچسپ حالات بیان کیے اور مجھے آئندہ پروگرام کے سلسلے میں ان سے نہایت اہم معلومات حاصل ہوئیں۔

میں ۱۹۵۱ء کے سفر میں لبنان کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا اور اب میرے لیے یہاں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ مجھے یہاں دو دن صرف اس لیے ٹھہرنا پڑا کہ مڈل ایسٹ کا طیارہ جس پر میں نے انقرہ سے ہی اپنی سیٹ بک کرائی تھی، بدھ کی رات کو بیروت سے روانہ ہونا تھا اور اس سے قبل میرے لیے جدہ کا رُخ کرنے کی کوئی اور صورت نہ تھی۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ بیروت سے دمشق ہو آؤں اور اس کے لیے میں نے ویزا بھی حاصل کر لیا تھا، لیکن دیارِ حبیبؐ کی کشش کچھ ایسی تھی کہ اب مجھے کسی اور طرف دیکھنا بھی ناگوار گزرتا تھا۔ پھر میں اپنے گزشتہ سفر میں دمشق کو اچھی طرح دیکھ بھی چکا تھا۔ بیروت ایک خوبصورت اور پُر رونق شہر ہے۔ اس کے قدرتی مناظر اور آب و ہوا کے باعث سیر و سیاحت کے دلدادگان اسے مشرقِ وسطیٰ کی بہترین سیرگاہ سمجھتے ہیں، لیکن میں یہاں انتہائی بے قراری کے ساتھ جدہ جانے والے ہوائی جہاز کے انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ بالآخر اس انتظار کی صبر آزما گھڑیاں ختم ہوئیں اور میں بدھ کی رات کو کوئی ایک بجے کے قریب مڈل ایسٹ ایرویز کے طیارے پر سوار ہو گیا۔

جدہ:

صبح چار بجے کے قریب ہمارا جہاز جدہ پہنچ گیا۔ ہوائی اڈے پر پاسپورٹ چیک کرنے والے افسر انتہائی فراغت اور اطمینان کا اظہار کر رہے تھے۔

قطار میں کھڑے کھڑے مجھے اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ میرا گرم لباس جسے میں نے بیروت کے موسم کے لحاظ سے پہن رکھا تھا ناقابلِ برداشت محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا اوور کوٹ اُتار لیا، لیکن باقی کپڑے اب بھی میری ضرورت سے بہت زیادہ تھے۔ بیروت اور جدہ کے موسم میں جنوری اور مارچ کا فرق تھا۔ جس سکون اور اطمینان سے ہوائی اڈے کے افسر مسافروں کی جانچ پڑتال کر رہے تھے، اس کے پیشِ نظر یہ محسوس ہوتا تھا کہ جب تک میری باری آئے گی، اس وقت تک میرا پسینہ قمیص سے کوٹ تک پہنچ جائے گا۔

اچانک مجھے سعودی عرب کے سفیر کا خط یاد آگیا جو مجھے کراچی میں دیا گیا تھا اور میں نے اسے اپنے تھیلے سے نکال کر پولیس کے ایک افسر کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ خط بہت کارآمد ثابت ہوا، کیونکہ جس رسمی کارروائی کے لیے مجھے ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ صرف کرنا تھا، وہ چند منٹوں میں پوری ہوگئی۔ میں نے ایک ٹیکسی لی اور چند منٹ کے بعد جدہ کے ایک ہوٹل میں پہنچ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے نہا دھو کر نفل ادا کیے۔ تھوڑی دیر بعد باہر سے فجر کی اذان سُنائی دینے لگی۔ نماز کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا۔ کمرے میں حبس تھا، اس لیے مجھے بجلی کا پنکھا

چلانا پڑا۔

رات بھر کی بے آرامی کے باوجود میری یہ نیند ایک ایسے مسافر کی نیند تھی، جس کے دل و دماغ پر منزل کے قُرب کا احساس حاوی ہو۔ کوئی دو یا اڑھائی گھنٹے کے بعد میں اُٹھ بیٹھا۔ نیچے جا کر پاکستان کے سفیر چودھری علی اکبر صاحب کو ٹیلی فون کیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ تم ہوٹل چھوڑ کر فوراً میرے پاس چلے آؤ، میں آدمی بھیج رہا ہوں۔ میں نے معذرت کی اور کہا کہ میں تھوڑی دیر تک مکہ معظمہ روانہ ہونے سے قبل آپ کے نیاز حاصل کروں گا اور وہاں سے واپسی پر آپ سے تفصیلی ملاقات ہو جائے گی۔ چودھری صاحب نے کہا کہ بھئی یہ بات نہیں ہوگی۔ میں تمھیں ایک منٹ کے لیے بھی کہیں اور ٹھہرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں کئی دن سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔"

میں نے پوچھا "آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں آرہا ہوں؟"

"مجھے چودھری فتح محمد صاحب نے لکھا تھا کہ تم آرہے ہو۔"

ٹیلی فون کرتے ہوئے میں نے ہوٹل کی گھڑی کی طرف دیکھا تو وہاں تین بج رہے تھے۔ میں اپنی گھڑی کو چابی دینا بھول گیا تھا، اس لیے مجھے وقت کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ تاہم میرے لیے یہ بات ناقابلِ یقین تھی کہ اب تین بج چکے ہیں۔ میں نے یہی خیال کیا کہ ہوٹل کی گھڑی میں بھی کوئی خرابی ہے۔

میں ابھی ناشتے سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ چودھری صاحب کا ڈرائیور پہنچ گیا۔ اس نے کسی تمہید کے بغیر ہوٹل کے ملازم کو میرا سامان اُتارنے کے لیے کہا۔ راستے میں مَیں نے اس سے وقت پوچھا تو اُس نے

اپنی گھڑی دیکھ کر بتایا کہ اب ساڑھے تین بج چکے ہیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "جناب! یہاں طلوعِ آفتاب کے وقت گھڑی کی سوئیاں بارہ بجاتی ہیں۔" چند اور سوالات کے جواب میں معلوم ہوا کہ مختلف موسموں میں دنوں کے گھٹنے بڑھنے سے وقت کے اس فارمولے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سورج خواہ کسی وقت نمودار ہو، عرب جب اسے طلوع ہوتا دیکھتے ہیں تو گھڑی کی سُوئیاں بارہ پر کر لیتے ہیں۔

چودھری علی اکبر صاحب بڑے تپاک سے ملے اور اُن کا پہلا سوال یہ تھا کہ تم نے اپنا نام رجسٹر کروا لیا ہے؟

میں نے جواب دیا "میں نے عام قاعدے کے مُطابق ہوائی اڈّے پر اپنا پاسپورٹ وغیرہ دکھایا تھا۔"

انھوں نے کہا "نہیں بھئی، یہاں جو لوگ آتے ہیں، اُن میں سے اکثر یہی غلطی کرتے ہیں۔ یہاں قانون یہ ہے کہ مسافروں کو اپنی آمد سے تین دن کے اندر پولیس کے دفتر میں اپنا نام رجسٹر کرا لینا چاہیئے ورنہ اس کے بعد ہر دن کے لیے جرمانے کی ایک بھاری رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔"

چودھری صاحب نے رجسٹریشن کا کام ایک کلرک کے ذمّہ لگایا اور میرا پاسپورٹ اس کے حوالے کر دیا۔

مجھے احرام خریدنے کے علاوہ سعودی عرب کا زرِ مبادلہ حاصل کرنا تھا، اس لیے میں نے چند منٹ بعد چودھری صاحب سے اجازت لی اور شہر کا رُخ کیا۔ سعودی ریال حاصل کرنے کے بعد میں نے ایک دوکان سے احرام کے لیے دو بڑے تولیے خرید لیے۔ واپس سفارت خانے پہنچا

تو چودھری صاحب وہاں سے مجھے اپنے مکان پر لے گئے جہاں میں نے کھانا کھاتے ہی احرام باندھا۔ عمرہ کی نیت کی اور ٹیکسی پر سوار ہو کر مکّہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۱۱)

مکّہ معظمہ

مشرق کے اُفق پر بادل چھا رہے تھے۔ ہم جدہ سے ابھی چند قدم دُور گئے تھے کہ یہ بادل تمام آسمان پر چھا گئے اور چند منٹ ہلکے ہلکے چھینٹوں کے بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور سڑکوں پر پانی بہنے لگا۔ ایک وسیع میدان جسے وادیٔ فاطمہ کے نام سے پکارا جاتا ہے، چھوٹی چھوٹی ندیوں کا ایک دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بارش تھم گئی اور ہموار زمین کے سینے سے سنگلاخ چٹانیں نمودار ہونے لگیں۔ پھر ان پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوا جو مکہ کی طرف بتدریج بلند ہوتی جاتی تھیں۔ ان ننگی اور سیاہی مائل پہاڑیوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر پہاڑی دوسری پہاڑی سے جدا نظر آتی ہے اور انھیں دیکھ کر زمانۂ قبل از اسلام کے عرب قبائل یاد آجاتے ہیں، جو اپنی نسلی اور قبائلی عصبیتوں کے باعث ایک دُوسرے سے کٹے ہوئے تھے۔

سڑک کے ایک موڑ سے ان پہاڑیوں کے درمیان اچانک ایک بلند و بالا چٹان دکھائی دیتی ہے، جس کی چوٹی ایک وسیع گنبد معلوم ہوتی ہے۔

ـــــــ میں پہاڑوں کے انتہائی دلکش اور دلفریب مناظر دیکھ چکا ہوں اور یہ صرف معمولی پہاڑی تھی، لیکن اس کی پہلی جھلک دیکھتے ہی میرے دل میں جو احساس پیدا ہوا، وہ بالکل نیا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا :

"اس پہاڑ کا نام کیا ہے؟"

"جبل النور" اس نے جواب دیا "غارِ حرا یہیں ہے۔"

میری نگاہوں کے سامنے ماضی کے نقاب اُلٹنے لگے اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ روئے زمین کی تمام رفعتیں جبل النور کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ یہ وہ پہاڑ ہے جس نے سب سے پہلے نبوت کا جاہ و جلال دیکھا تھا اور اس کی چوٹی کے قریب وہ غار ہے، جہاں سرورِ کونینؐ کو جبریلِ امینؑ ربّ العالمین کا اوّلین پیغام لے کر آئے تھے۔

جس نور کے لیے مشرکینِ مکّہ نے خانہ کعبہ کے دروازے بند کر دیے تھے، اس کے لیے اس سنگلاخ چٹان نے اپنا سینہ کھول دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کار مکہ کی گلیوں اور بازاروں سے ہوتی ہوئی حرم کے قریب رُکی۔ باب الصفا پر چند معلم کھڑے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو اپنے ساتھ لیا اور بارگاہِ خداوندی کے جاہ و جلال کے تصور سے لرزتا ہوا اندر داخل ہوا۔ صحن میں پاؤں رکھتے ہی خانہ کعبہ پر نظر پڑی اور مجھے اچانک ایسا محسوس ہوا کہ اس کی چھت آسمان کو چھو رہی ہے۔ سینکڑوں آدمی وہاں طواف کر رہے تھے۔ کسی کو دُوسرے کی طرف دیکھنا گوارا نہ تھا۔ جو طواف سے فارغ ہو چکے تھے، ان میں سے کوئی حطیم کے اندر نفل پڑھ رہا تھا اور کوئی غلافِ کعبہ تھام کر گریہ وزاری کر رہا تھا۔ کسی کو کسی کے ساتھ سروکار نہ تھا۔ کسی کو کسی کے ساتھ دلچسپی نہ تھی ـــــــ وہ مختلف سمتوں سے آئے

تھے، لیکن وہاں مشرقی اور مغربی، کالے اور گورے، امیر اور غریب، ادنیٰ اور اعلیٰ کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ میرا معلم ایک حبشی نژاد تھا۔ میں نے اس کی رہنمائی میں طواف شروع کیا۔ میری خود فراموشی کا یہ عالم تھا کہ کبھی چلتے چلتے میری رفتار اتنی کم ہو جاتی کہ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے آگے دھکیلنے کی کوشش کرتا اور کبھی میرے قدم اتنے تیز ہو جاتے کہ اُسے میرے ساتھ بھاگنا پڑتا۔

لیکن دو تین چکر لگانے کے بعد میں سنبھل چکا تھا۔ خانہ کعبہ کے گرد سات چکر پورے کرنے اور ہر بار حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے بعد معلم نے مجھے باب الرحمۃ کے سامنے کھڑا کر کے دُعا پڑھانی شروع کی۔ وہاں شاید پہلی بار یہ خیال آیا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں اور اس کے ساتھ ہی میری آواز بیٹھ گئی۔ میں بڑی کوشش کے ساتھ رُک رُک کر اپنے معلم کے دُعائیہ کلمات دُہرا رہا تھا، لیکن اچانک میری قوتِ گویائی جواب دے گئی اور آنسوؤں کا ایک سیلاب جو نہ جانے کب سے اس وقت کا منتظر تھا، میری آنکھوں سے پھوٹ نکلا۔

یہ ایک ایسا مقام تھا، جہاں بچے کی طرح سسکیاں لینا بھی مجھے معیوب نہیں معلوم ہوتا تھا ــــ کسی نے میری طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کسی نے یہ نہ پوچھا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ ان کی بے اعتنائی اور بے توجہی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ایک انسان کے آنسو اسی مقام کے لیے ہیں۔

معلم نے قدرے توقف کے بعد دوبارہ دُعا شروع کی اور میں سسکیوں کے ہجوم میں اس کے الفاظ دُہرانے لگا۔ پھر اس نے

شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے ذرا آگے کر دیا۔ میں نے بابِ رحمت کی دہلیز پر ہاتھ پھیلا دیے اور دیر تک کھڑا رہا۔ اس وقت میرے دل میں کوئی دُعا تھی تو اس کے لیے الفاظ نہ تھے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے پیچھے اور لوگ کھڑے ہیں۔ میں نے ایک طرف ہو کر خانہ کعبہ کا غلاف تھام لیا۔ اب طبیعت قدرے ہلکی ہو چکی تھی۔ آہستہ آہستہ میری زبان سے دُعائیں نکلنے لگیں۔ وہ ہاتھ جو میں نے دُعا کے لیے اُٹھائے تھے، پھیلتے گئے۔ ایک گدا کے لیے ہاتھ پھیلانے کی اس سے بہتر جگہ اور کیا ہو سکتی تھی؟ میں کبھی پاکستان کے مسلمانوں کی سربلندی کے لیے دُعا کر رہا تھا۔ کبھی کشمیر کی آزادی کا طلب گار تھا۔ کبھی ہندی مسلمانوں کی فریاد سُنا رہا تھا اور کبھی الجزائر اور فلسطین کے مسلمانوں کے لیے التجائیں کر رہا تھا۔

خانہ کعبہ کے طواف سے فارغ ہونے کے بعد میں نے صفا اور مروا کے درمیان چکر لگائے۔ پھر سر منڈایا۔ اس کے بعد چاہِ زمزم کا پانی پیا۔ اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

نمازِ مغرب سے فارغ ہو کر میں عشا کی نماز تک کبھی خانہ کعبہ کے طواف، کبھی حطیم اور مقامِ ابراہیم میں نوافل پڑھنے میں مشغول رہا۔ اس دوران میں مجھے میزابِ رحمت کے عین نیچے کھڑے ہو کر نفل پڑھنے کا موقع مل گیا۔ عشاء کی نماز کے بعد میں کوئی گیارہ بجے تک طواف کرتا رہا۔

رات کے وقت میرا قیام حرم کے قریب اس مکان میں تھا، جس کا ایک حصہ پاکستانی سفارت خانے نے کرایہ پر لے رکھا ہے۔ میں اس مکان میں پہنچا تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ کوئی چار گھنٹے آرام کرنے کے بعد میں پچھلے پہر اُٹھا اور حرم کی جانب چل دیا۔ اب بارش

خاصی تیز ہو چکی تھی، لیکن میں مکہ کی بارش میں بھیگنا اپنے لیے بڑی سعادت سمجھتا تھا۔

یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ مکہ میں میری آمد سے ایک دن قبل نماز استسقاء پڑھی گئی تھی۔

میں حرم کے اندر داخل ہوا تو اس وقت بھی کئی لوگ طواف کر رہے تھے۔

بعد میں اہل مکہ کی زبانی مجھے یہ معلوم ہوا کہ دن ہو یا رات، خانہ کعبہ کے گرد ہر وقت طواف کرنے والوں کی ایک خاصی تعداد موجود رہتی ہے۔ میں حطیم کے اندر داخل ہوا اور میزاب رحمت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ یہ خانہ کعبہ کی چھت کا پرنالہ ہے۔ اس کے نیچے نفل پڑھتے وقت بالکل بھیگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد لوگوں کا ایک اچھا خاصا ہجوم وہاں جمع ہو چکا تھا۔ میں نے اُٹھ کر طواف کرنا شروع کر دیا اور صبح کی اذان تک طواف میں مشغول رہا۔ نماز کے وقت بارش تھم چکی تھی۔ طلوع آفتاب کے وقت میں نے حرم کی چاردیواری کے اندر چکر لگایا۔ سعودی حکومت نے حرم کی توسیع کا جو کام شروع کیا تھا، وہ ابھی تک جاری ہے۔ صفا اور مروہ کے درمیان ایک طویل ہال بن چکا ہے اور اب یہاں طواف کرنے والوں کو دھوپ نہیں برداشت کرنی پڑتی۔ باب الصفا کی سمت پرانی عمارت کے پیچھے دو منزلہ وسیع ہال پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔ جب دوسری طرف مزید توسیع کے بعد اس قسم کے کشادہ اور وسیع ہال بن جائیں گے تو اپنی وسعت کے لحاظ سے یہ عمارت اپنی مثال آپ ہو گی۔

بیت اللہ شریف اسی قسم کی سیاہی مائل برہنہ اور وحشت ناک

چٹانوں سے گھرا ہوا ہے جن کا ذکر اس سے پہلے آ چکا ہے۔ حرم سے باہر نکل کر مکہ کے چاروں اطراف نظر دوڑانے کے بعد میں اس زمانے کا تصور کر رہا تھا جب یہ بے آب وگیاہ خطہ انسان کے وجود سے خالی تھا، جب حضرت ابراہیمؑ اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں ہاجرہؓ اور اسمٰعیل علیہ السلام کو یہاں چھوڑ گئے تھے۔ خلیل اللہ کا امتحان یہی نہیں تھا کہ وہ اپنی وفا شعار بیوی اور معصوم بیٹے سے جدا ہو رہے تھے، بلکہ اس سے بڑا امتحان یہ تھا کہ ایک عظیم پیغمبر جس کا مقصد انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلے کو سلامتی کا راستہ دکھانا تھا، اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع کو ایک ویرانے میں چھوڑ کر جا رہا تھا، جہاں ان کے زندہ رہنے کے کوئی ظاہری اسباب نہ تھے، جہاں دن کی تیز دھوپ میں چاروں اطراف مہیب اور بے رحم پہاڑوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا، جہاں جھلس دینے والی ہواؤں کی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز نہ تھی اور پھر غروب آفتاب کے بعد تاریک لبادے میں یہ پہاڑیاں کتنی ہولناک اور بھیانک معلوم ہوتی ہوں گی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور بچے کو اس مقام پر چھوڑ آئے تھے، جس کا ایک ایک ذرہ کہہ رہا ہو گا کہ یہ جگہ انسانوں کے لیے نہیں۔ خالق اکبر نے اس سے قبل اپنے کسی بندے کو اتنی بڑی آزمائش میں نہیں ڈالا تھا اور انسانی تاریخ اس عزم و ثبات اور حوصلے کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جس کا مظاہرہ خلیل اللہؑ نے کیا تھا۔

اس بے آب وگیاہ وادی کے سینے سے چشمۂ زمزم کا پھوٹ نکلنا اور کسی قافلے کا وہاں آ کر آباد ہو جانا، قدرت کے معجزات تھے، لیکن اس سے بڑا معجزہ یہ تھا کہ ایک انسان اپنے اللہ کی رضا کے لیے بشریت کے تمام

تقاضے جھٹلا چکا تھا۔ مکہ کی بیرونی اطراف میں گشت کرتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ بے آب وگیاہ وادی، یہ برہنہ اور ہیبت ناک پہاڑیاں صدیوں سے خدا کی رحمتوں کو پکار رہی تھیں۔ پھر ایک دن حق پرستوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ جو ایک کمسن بچے اور اس کے والدین پر مشتمل تھا، اپنے جلو میں خدا کی رحمتیں لیے نمودار ہوا۔ جب وہ وادیٔ بطحا میں داخل ہوئے تو شوہر نے اپنی بیوی سے کہا :

"خدا کی رضا یہی ہے کہ میں تمہیں یہاں چھوڑ کر واپس چلا جاؤں۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت ہاجرہ اور اپنے کمسن بچے حضرت اسمٰعیلؑ کو اس بھیانک ویرانے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ بچے کے ہونٹ پیاس سے خشک ہو رہے تھے۔ حضرت ہاجرہ اسے زمین پر لٹانے کے بعد کبھی بھاگ کر صفا کی طرف جاتی تھیں، کبھی مروہ کی طرف۔ وہاں پانی کے مطلق آثار نہ تھے لیکن خلیل اللہؑ کی بیوی نے خدا کی رحمت سے مایوس ہونا نہیں سیکھا تھا۔ بارگاہِ ایزدی سے دعاؤں کا جواب آیا اور خشک زمین کے سینے سے پانی کا دھارا پھوٹ نکلا۔ جب ان پہاڑیوں نے تین افراد کا یہ چھوٹا سا قافلہ دیکھا ہوگا تو اس وقت یہ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ زمین کروڑوں انسانوں کی سجدہ گاہ بننے والی ہے۔ جب حضرت ہاجرہ صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگا رہی تھیں تو اس وقت یہ کون کہہ سکتا تھا کہ ان کا یہ اضطراری فعل آنے والے ادوار میں کروڑوں انسانوں کے لیے ایک سنت بن جائے گا اور جب ایک بھولے بھٹکے قافلے نے چشمے کو دیکھ کر اس کے کنارے ڈیرے ڈال دیے تھے تو کون کہہ سکتا تھا کہ قیامت تک اطرافِ عالم سے ان گنت قافلے آبِ زمزم سے پیاس بجھانے کے لیے آتے رہیں گے۔ آج صدیوں کے بعد جس طرح چوبیس گھنٹے کعبے کا

طواف ہوتا ہے، اسی طرح صفا اور مروہ کے درمیان انسانوں کا ہجوم رہتا ہے۔ میں نے ان لوگوں کو بھی صفا اور مروہ کے درمیان دیوانہ وار دوڑتے دیکھا ہے، جو عام حالات میں لوگوں کے سامنے ذرا بے احتیاطی سے قدم اٹھانا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ میں نے وہاں ان نحیف اور لاغر بوڑھوں کو جوانوں کی طرح دوڑتے دیکھا ہے جو چلنے سے معذور نظر آتے ہیں۔ خدا کی رضا کے لیے اس سے بڑی قربانی نہیں دی گئی اور کسی قربانی دینے والے کو خلقِ خدا کی جانب سے اتنا بڑا خراج پیش نہیں کیا گیا۔

حرم کے پاس ہی جبلِ فاران کی چوٹی پر جہاں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نے فتحِ مکہ کے وقت اذان دی تھی، ایک چھوٹی سی مسجد دکھائی دیتی ہے۔ اس مسجد کو حضرت بلالؓ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

طلوعِ آفتاب سے کوئی ایک گھنٹہ بعد میں نے ایک ٹیکسی لی اور عرفات اور منیٰ کے میدان کی طرف روانہ ہوا۔ شہر سے نکلنے کے بعد مجھے ایک طرف جبلِ نور دکھائی دیتا تھا، جو غارِ حرا کے باعث مشہور ہے۔ دوسری طرف جبلِ ثور نظر آتا تھا، جس کے ایک غار میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت فرماتے ہوئے تین دن اور تین رات قیام فرمایا تھا۔ ابنِ ہشام کی روایت کے مطابق حضرت اسمٰاءؓ ہر شام گھر سے کھانا پکا کر اس غار میں لے آتی تھیں۔ جبلِ ثور مکہ سے کوئی تین میل دور ہے اور اس کی بلندی ایک میل کے لگ بھگ ہے۔ حضرت اسمٰاءؓ کا انتہائی دشوار گزار راستوں سے ہر روز شام کی تاریکی میں وہاں پہنچنا عزم و ایثار کی تاریخ کا عظیم کارنامہ ہے۔

عرفات ایک وسیع میدان ہے اور اس سے آگے ان پہاڑیوں کا

سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جو طائف کی جانب بلند پہاڑوں سے جا ملتی ہیں۔ جبلِ رحمت اسی میدان میں ہے۔ یہ پہاڑی زیادہ اونچی نہیں اور اس کی چوٹی پر ایک چاردیواری مسجد کا کام دیتی ہے۔ میں نے یہاں نفل پڑھے اور دُعا مانگی پھر اُٹھ کر چاروں طرف نظر دوڑائی اور ان قافلوں کا تصور کرنے لگا جو حج کے ایام میں ــــــ لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ــــــ کہتے ہوئے عرفات کے میدان میں داخل ہوتے ہیں۔ جبلِ رحمت کے قریب ایک مسجد کے علاوہ چند چھپّر بھی ہیں، جن سے حج کے ایام میں دکانوں کا کام لیا جاتا ہے۔ اس دن صرف چائے کی ایک دکان کھلی تھی، جس کے سامنے دو تین بدوی بیٹھے ہوئے تھے۔ منیٰ میں چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں کی ایک خاصی تعداد موجود ہے جو مقامی آبادی کے لوگوں نے حاجیوں کو کرائے پر دینے کے لیے بنا رکھے ہیں۔

عرفات اور منیٰ کی زیارت کے بعد مکہ کی دوسری طرف کچھ فاصلے پر میں نے تنعیم کی زیارت کی۔ یہاں ایک مسجد حضرت عائشہ رضؓ کے نام سے منسوب ہے۔ واپس آکر میں نے شہر کی سیر کی۔ مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں پھرتے وقت مجھے بار بار حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعا یاد آ رہی تھی :

"اے ہمارے رب!
میں نے اپنی اولاد کو تیرے حرمِ محترم کے پاس
بے آب و گیاہ وادی میں بسایا ہے تاکہ یہ لوگ نماز قائم
کریں۔ پس اپنے فضل سے لوگوں کے دل ان کی طرف
مائل کر دے اور انھیں پھلوں سے روزی دے تاکہ
وہ تیرے شکرگزار رہیں۔"

اور حضرت خلیل اللہؑ کی اس دعا کا یہ اثر ہے کہ اس وادیٔ غیر ذی زرع کے باشندوں کے لیے رزق کبھی پریشان کن مسئلہ نہیں بنا۔ یہ وہ زمین ہے جہاں گھاس کی کونپل یا درخت کی شاخ تک اجنبی محسوس ہوتی ہے، لیکن مکہ کے بازاروں میں انواع و اقسام کے پھلوں کی بہتات تھی۔ طائف کے میوہ جات کے علاوہ شام، لبنان اور اٹلی تک کے بہترین پھل یہاں پہنچتے ہیں۔ میں نے مکہ کی دکانوں پر انار، سیب اور انگور کی بہترین اقسام دیکھی ہیں، اور یہ بات قارئین کو ناقابلِ یقین معلوم ہوگی کہ وہاں ایک ریال یعنی تقریباً ایک روپیہ میں نہایت عمدہ قسم کے آٹھ کیلے ملتے تھے۔ ان دنوں دُور دراز کے مقامات سے بیشتر میوہ جات ہوائی جہازوں پر لائے جاتے ہیں۔ وہاں ایک پاکستانی نے مجھے بتایا کہ یہاں بے موسم کے پھل بھی ملتے ہیں۔ صرف تین چار روز قبل میں نے یہاں ایک دکان سے بہترین آم خریدے تھے، جو غالباً مصر سے آئے تھے۔

یہ جمعہ کا دن تھا۔ میں نماز کے وقت حرم میں پہنچا تو پاکستان کے سفیر چودھری علی اکبر وہاں موجود تھے۔ نماز اور اس کے بعد طواف سے فارغ ہو کر میں نے چودھری صاحب کے ساتھ جنت المعلیٰ کا رُخ کیا۔ یہ مکہ کا قدیم قبرستان ہے، جہاں کہیں کہیں بزرگانِ دین کی مسمار شدہ قبروں کے معمولی نشان باقی رہ گئے ہیں۔ میرا معلّم مجھے اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی قبر پر لے گیا۔ دوسری قبروں کی طرح یہ قبر بھی تقریباً ہموار کر دی گئی ہے اور اردگرد چند ٹوٹی ہوئی سلیں چُن دی گئی ہیں۔ دُعا کے بعد میں دیر تک ہاتھ اُٹھائے وہاں کھڑا رہا اور میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ دیواریں مسمار کی جا سکتی ہیں، قبے توڑے جا سکتے ہیں، لیکن ان شکستہ قبروں پر انوارِ الٰہی کی بارش کون روک سکتا ہے؟

اب میرا رُخ جدہ کی طرف تھا اور میری منزلِ مقصود مدینہ تھی۔ میں اس

مقدس زمین کو خیرباد کہہ رہا تھا جس کی آغوش سے نورِ ہدایت کا سیلاب نمودار ہوا تھا اور میں اس دلفریب وادی کی طرف جا رہا تھا، جس نے تمام دُنیا سے زیادہ نُور کے اس سیلاب کی جولانیاں دیکھی تھیں۔

حُدیبیہ

مکہ سے چند میل دُور مجھے سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی مسجد دکھائی دی۔ میرے استفسار پر چودھری علی اکبر صاحب نے بتایا کہ یہ مقام حُدیبیہ ہے، جہاں ترکوں نے یہ مسجد تعمیر کی تھی۔ حدیبیہ کا نام سُن کر میرے ذہن پر تاریخ اسلام کے ایک اہم واقعہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ میں موٹر سے اُتر کر اس طرف چل دیا۔ یہ وہ مقدس مقام تھا جہاں صلحِ حُدیبیہ اور بیعتِ رضوان کے واقعات پیش آئے تھے۔ ہجرت کے چھٹے سال سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کے ارادے سے مدینہ منورہ سے مکہ کی طرف کوچ فرمایا تو راستے میں اطلاع ملی کہ قریش بڑے زور و شور کے ساتھ مزاحمت کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اہلِ مدینہ کا قافلہ مکہ کے قریب پہنچ چکا تھا، لیکن دشمن کی نقل و حرکت کی اطلاع ملنے پر حضور نے حدیبیہ میں قیام فرمایا اور اہلِ مکہ کو یہ پیغام بھیجا کہ ہمارا مقصد جنگ نہیں بلکہ ہم عمرہ کی غرض سے یہاں آئے ہیں۔ چند دن ایلچیوں کا تبادلہ ہوتا رہا اور اس کے بعد اہلِ مکہ کے ساتھ صُلح کی شرائط طے کرنے کی مہم حضرت عثمانؓ کو سونپی گئی، لیکن جب حضرت عثمانؓ مکہ پہنچے تو قریش نے آپؓ کو نظر بند کر دیا اور یہ خبر مشہور ہو گئی کہ آپؓ شہید کر دیے گئے ہیں۔ جب یہ خبر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص

لینا فرض ہے۔ یہ کہہ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ببول کے ایک درخت کے نیچے حق پرستوں کے اس قافلے کے تمام افراد سے جس میں عورتیں بھی شامل تھیں، جاں نثاری کی بیعت لی۔ اس بیعت کو بیعۃ الرضوان کہا جاتا ہے اور سُورہ فتح میں ان الفاظ کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے :

"خدا مسلمانوں سے راضی تھا، جبکہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ سو خُدا نے جان لیا، جو کچھ ان کے دلوں میں تھا تو خدا نے ان پر تسلی نازل کی اور ان کو عاجلانہ فتح دی۔"

لیکن اس کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ خبر صحیح نہ تھی۔ قریش نے اپنی طرف سے ایک بہترین مقرر سہیل بن عمرو کو صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے بھیجا۔ سہیل کے ساتھ گفتگو کے بعد حضورؐ نے چند شرائط پر اتفاق فرمایا اور حضرت علیؓ کو معاہدہ کے الفاظ قلم بند کرنے کا حکم دیا۔ یہ شرائط حسبِ ذیل تھیں :

(۱) مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔
(۲) اگلے سال آئیں اور تین دن سے زیادہ مکہ میں قیام نہ کریں۔
(۳) ہتھیار لگا کر نہ آئیں۔ صرف تلوار ساتھ لائیں اور وہ بھی اس صورت میں کہ تلوار نیام کے اندر ہو اور نیام کسی تھیلے میں بند ہو۔
(۴) مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں، ان میں سے اہلِ مدینہ کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور اگر ان کا کوئی ساتھی مکہ میں رہنا چاہے تو اسے رہنے دیں۔
(۵) کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے گا، لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ جائے تو واپس نہیں کیا

جائے گا۔

(۶) عرب قبائل کو اختیار ہوگا کہ وہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہوجائیں۔"

ظاہری صورت میں یہ شرطیں سراسر مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ صحابہؓ دم بخود کھڑے تھے۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے ان کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیا۔

یہ معاہدہ ابھی لکھا جا رہا تھا کہ سہیل کے صاحبزادے حضرت ابوجندلؓ جو اسلام لا چکے تھے، کفارِ مکہ کی قید میں ان گنت اذیتیں برداشت کرنے کے بعد وہاں سے کسی طرح بھاگ نکلے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ وہ بھوک، پیاس اور زخموں سے نڈھال تھے اور ابھی تک ان کے پاؤں میں بیڑیاں موجود تھیں۔ وہ آئے اور نڈھال ہو کر رحمۃ للعالمین کے سامنے گر پڑے۔

باپ کفارِ مکہ کا نمائندہ بن کر پیغمبرِ اسلام کے ساتھ معاہدہ کر رہا تھا اور بیٹا جو اسلام لا چکا تھا، حبیبِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے زخم دکھا رہا تھا۔ سہیل اپنے بیٹے کو واپس لے جانے پر بضد تھا۔

فدایانِ رسولؐ ایک ذہنی اضطراب اور کش مکش میں مبتلا تھے۔ ایک طرف ان کا ایک مظلوم بھائی تھا، جس کے جسم پر زخموں کے نشان دیکھ کر ان کا خون کھول رہا تھا۔ دوسری طرف وہ آقائے برحقؐ تھے جن کے معمولی اشارے پر وہ آلام و مصائب کا پہاڑ اٹھا سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ ضبط نہ کر سکے اور انھوں نے سب سے زیادہ ابوجندلؓ کی حمایت میں آواز بلند کی، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے سامنے انھوں نے گردن جھکا دی۔ حضورؐ نے ابوجندل کو تسلی دی اور وہ اسی طرح پابزنجیر سہیل کے ساتھ چل پڑے۔

مسلمانوں کے لیے یہ منظر انتہائی صبر آزما تھا۔ صلح کے تین دن بعد جب آپ حدیبیہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو یہ آیت نازل ہوئی:

"ہم نے تم کو فتح مبین عنایت کی۔"

اور فدایانِ رسول کے چہرے مسرت سے چمک اٹھے۔ معاہدۂ حدیبیہ کے وقت انھوں نے ایک ایسے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تھا، جو اس وقت ان کی سمجھ سے بالاتر تھا، لیکن اس آیت کے نزول کے بعد حدیبیہ کے واقعہ کو اسلام کے مستقبل کے لیے ایک نیک فال تصور کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے انتہائی اضطراب کی حالت میں جو معروضات پیش کی تھیں، ان کے متعلق انھیں ساری عمر رنج رہا۔ یہاں تک کہ انھوں نے کفارہ کے لیے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، خیرات کی اور غلام آزاد کیے۔

حدیبیہ کے واقعات صحابہؓ کی اطاعت شعاری کے سخت ترین امتحان تھے اور جب وہ اس امتحان سے سرخرو ہو کر نکلے تو ان کے دلوں میں شکست کے احساس کی جگہ فتح کی امید کے چراغ روشن تھے۔

بعد کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس صلح کے نتائج مسلمانوں کے لیے کتنے سود مند تھے۔ کفارِ مکہ نے پہلی بار مسلمانوں کو ایک فریق کی حیثیت سے تسلیم کیا تھا۔ اس سے قبل ان کا موقف یہی تھا کہ مسلمان ہم میں سے ہیں اور ہم اپنے میں سے کسی کو اپنا آبائی راستہ چھوڑ کر نیا دین قبول کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

لیکن اس معاہدے کے بعد انھوں نے مسلمانوں کو اپنے مقابلے میں طاقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ اب تک کفار اور مسلمانوں کے درمیان کوئی ربط و ضبط نہ تھا، لیکن صلح کے بعد مکہ اور مدینہ کے درمیان آمد و رفت

شروع ہوئی اور کفار مسلمانوں کے ساتھ میل جول کے باعث بڑی تیزی کے ساتھ اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔

میں نے حدیبیہ کی مسجد میں عصر کی نماز پڑھی اور اس کے بعد بارگاہِ ایزدی میں دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ کشمیر کے پینتیس لاکھ بے بس اور مظلوم مسلمان میرے ساتھ دُعاؤں میں شریک ہیں۔ تھوڑی دیر میں میں جدّہ پہنچ چکا تھا۔

جدّہ سے مدینہ کی طرف

شام کے وقت چودھری علی اکبر صاحب کے مکان پر دو ناقابلِ فراموش شخصیتوں سے ملاقات ہُوئی۔ اُن میں سے ایک ڈاکٹر مغربی تھے، جو آنکھوں کے علاج میں اپنی غیر معمولی مہارت اور قابلیت کے باعث دنیا کے چند بہترین ڈاکٹروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مغربی اس سے قبل مصر میں پریکٹس کرتے تھے، لیکن انقلابی حکومت کے دَور میں مصر کا ماحول اپنے لیے ناسازگار پاکر انھیں وہاں سے ہجرت کرنی پڑی۔ ایک صاحبِ کمال ہر ماحول کو اپنے لیے سازگار بنا لیتا ہے اور ان دنوں ڈاکٹر مغربی کی یہ حالت ہے کہ جدّہ میں ان کا اپنا ایک شان دار ہسپتال ہے اور سعودی عرب کا طبقۂ اعلیٰ انھیں بڑے احترام سے دیکھتا ہے۔

دوسرے صاحب جو ہر پاکستانی کو گلے لگا کر بھینچ لیتے ہیں، ڈاکٹر فاطمی تھے۔ جو مشرقِ وسطیٰ میں عربی کے چند بہترین خطیبوں اور انشا پردازوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فاطمی صاحب کو اخوان المسلمون کے ساتھ

اپنے سابقہ تعلقات کے باعث دمشق چھوڑنا پڑا۔ وہ بیروت میں وکالت کرتے ہیں اور فرصت کے ایام میں جدہ تشریف لاتے ہیں۔

یہ دونوں نوجوان ہیں، دونوں کو عالمِ اسلام کے مسائل کے ساتھ گہری دلچسپی ہے، اور دونوں کی شخصیت ایسی ہے کہ ایک اجنبی ان سے چند منٹ باتیں کرنے کے بعد یہ محسوس کرتا ہے کہ میں انھیں مُدت سے جانتا ہُوں۔

چودھری علی اکبر نے میرا تعارف کرایا اور چند منٹ بعد ہم انتہائی بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ ان حضرات کو جس قدر الجزائر اور فلسطین کے ساتھ دلچسپی ہے، اسی قدر یہ کشمیر کے حالات سے بھی واقف تھے۔ عرب ممالک میں اپنے گزشتہ اور موجودہ سفر کے دوران کسی اور ایسے شخص سے میری ملاقات نہیں ہوئی جس نے پاکستان کے مسائل کے ساتھ اس قدر دلچسپی کا اظہار کیا ہو یا پاکستان کے متعلق جس کی معلومات اس قدر مکمل ہوں۔ پاکستان سے ان حضرات کی دلچسپی ایک دُور کے تماشائی کی دلچسپی نہ تھی، بلکہ ان کی باتوں سے مجھے اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ وہ پاکستان کو ملتِ اسلامیہ کے وجود کا ایک اہم حصہ سمجھتے ہیں۔

یہ دونوں شخصیتیں متحدہ عرب جمہوریہ کی معتوب تھیں، لیکن ان کی گفتگو سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ مصر و شام کے ساتھ ان کی ذہنی و رُوحانی وابستگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اس بات پر خوش ہو رہے تھے کہ پاکستان کے ساتھ متحدہ عرب جمہوریہ کے تعلقات بہتر ہو رہے ہیں اور جمال عبدالناصر نے پاکستان آنے کی دعوت قبول کر لی ہے۔ کوئی تین گھنٹے کی پُرلطف گفتگو کے

بعد یہ مجلس برخاست ہوئی اور یہ حضرات تشریف لے گئے۔

اگلی صبح گیارہ بجے کے قریب میں مدینہ منورہ کا رخ کر رہا تھا۔ میرے ساتھ اگلی سیٹ پر ایک عرب بیٹھا ہوا تھا اور پچھلی سیٹ پر ایک کمسن بچی اور دو پردہ نشین خواتین تھیں۔ جونہی جدہ کے ٹیکسی سٹینڈ سے ہماری کار روانہ ہوئی، پچھلی سیٹ سے ایک خاتون کی ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔

ہمارا ڈرائیور ہر لحاظ سے ایک بدوی تھا۔ اس نے بلاتوقف کار کے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔ ریڈیو سے "ہٰذا صوت العرب" کی آواز آئی اور اس کے بعد مصری نغمے سنائی دینے لگے۔ "صوت العرب" کے ہنگامے کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خاتون کی آہیں اور سسکیاں بلند ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ قاہرہ ریڈیو سے نغموں کے بعد پرجوش تقریریں اور ان کے بعد مکالمے نشر ہونے لگے۔ پھر کچھ دیر پرجوش نعرے سنائی دیتے رہے اس کے بعد دوبارہ موسیقی کا پروگرام شروع ہوا۔ ادھر رونے والی خاتون کی سسکیوں کا تسلسل ٹوٹنے لگا اور وہ اکھڑی ہوئی آواز میں دوسری خاتون کو اپنی سرگزشت سنانے لگی۔ کبھی کبھی اس کی آواز بے قابو ہو جاتی اور وہ پھر رونا شروع کر دیتی۔ میں صرف یہ سمجھ سکا کہ وہ الجزائر کی رہنے والی ہے اور اس کی زندگی کی تمام راحتیں چھن چکی ہیں اور اب وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر اپنے بھائیوں اور بیٹوں کی فریاد لے کر جا رہی تھی۔ مجھے اس کے ذاتی مصائب کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں، لیکن میرے لیے یہی جان لینا کافی تھا کہ وہ الجزائر سے آئی ہے۔

اس کی کرب انگیز آہیں ان بے شمار داستانوں کی تصدیق کر رہی تھیں

جو میں نے فرانس میں اہل فرانس کی وحشت و بربریت کے متعلق سنی تھیں۔ کاش میں اس عورت کی چیخیں، امن عالم کے ان اجارہ داروں کے کانوں تک پہنچا سکتا، جن کی آنکھوں کے سامنے الجزائر میں وحشت اور بربریت کا عفریت ننگا ہو کر ناچ رہا ہے۔

(۱۶)

مدینہ منورہ

ہم ایک ہموار اور بے آب وگیاہ میدان سے گزر رہے تھے۔ میرے بائیں ہاتھ بحیرۂ احمر تھا اور دائیں ہاتھ پر چند میل دور پہاڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ کبھی کبھی یہ سڑک سمندر کے اس قدر قریب ہو جاتی کہ ہمیں سمندر کا پانی دکھائی دینے لگتا تھا۔ جدّہ سے مدینہ منورہ کوئی اڑھائی سو میل ہے۔

قریباً ایک تہائی راستہ طے کرنے کے بعد سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی آبادی میں رک گئے۔ یہاں ایک دکان کے کشادہ چھپر کے نیچے بیٹھ کر ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ ظہر کی نماز پڑھی اور دوبارہ کار پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر اور چلنے کے بعد یہ سڑک سمندر کے ساحل سے ہٹنے لگی، یہاں تک کہ ہم ہموار زمین سے نکل کر ان پہاڑوں میں داخل ہو چکے تھے جن کی وادیوں کا ایک سلسلہ یثرب کے ساتھ جا ملتا ہے۔ بیشتر راستہ سڑک کی دونوں طرف زندگی کے آثار صرف ببول کے درختوں اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں تک محدود تھے، لیکن اچانک کسی وادی میں ہمیں چھوٹے چھوٹے نخلستانوں کے دلکش مناظر دکھائی دینے لگتے۔

مقامِ بدر کے قریب ہم ایک بستی میں رکے اور وہاں عصر کی نماز ادا

کرنے کے بعد آگے چل پڑے۔ اب منزلِ مقصود ہر آن قریب آ رہی تھی اور میرے دل و دماغ اور رُوح کی تمام حسیات سمٹ کر نگاہوں میں آ چکی تھیں۔

میرے دائیں بائیں اور سامنے وہ چٹانیں، وہ پہاڑ اور وہ وادیاں تھیں جنھوں نے آفتابِ نبوت کی ضیا پاشیاں دیکھی تھیں اور میرے دل میں ہر لحظہ ان کی تقدیس اور عظمت کا احساس بڑھ رہا تھا۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا اور ہمیں مغرب کی نماز کے لیے راستے کی ایک اور بستی میں رکنا پڑا۔ کچھ دیر بعد رات کی تاریکی میں ہمیں مدینہ منورہ کے مضافات کی روشنی دکھائی دینے لگی۔ پھر ایک موڑ سے آگے ہمیں وہ مینار دکھائی دیے جن پر بجلی کے قمقمے لگے ہوئے تھے۔ ڈرائیور نے اچانک ریڈیو بند کر دیا اور صوت العرب کے ہنگامے، جنھوں نے مسلسل سات گھنٹے ہمارے حال سے بے اعتنائی برتی، اچانک خاموش ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خاتون نے پھر رونا شروع کر دیا۔ دوسری عورت اسے صبر کی تلقین کرنے لگی، لیکن اس کی کرب انگیز چیخوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ پھر موٹر ایک پُر رونق بازار میں رکی اور وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ شاید اس لیے کہ بارگاہِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے قربت کا احساس اس پر غالب آ چکا تھا۔

میں نے اپنا سامان ایک مزدور کے حوالے کیا اور مدینہ کے مشہور معلم جناب حیدالحیدری کے دفتر پہنچا۔ انھیں میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ اپنے چند رفقا کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے۔ حیدری صاحب سے دو منٹ باتیں کیں تو قریب ہی مسجدِ نبویؐ سے عشا کی اذان سنائی دینے لگی۔ حیدری صاحب نے مجھے نماز کے لیے تیار ہونے کو کہا اور میں نے اپنی اچکن اتار کر ایک کرسی پر پھینک دی اور پانی کا کوزہ لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اب میری حالت ناقابلِ بیان تھی۔ میں سارا راستہ یہ سوچتا آ رہا تھا کہ جب میں مدینہ منورہ میں داخل ہوں

گا تو میری ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ جب میں گنبدِ خضرا کی پہلی جھلک دیکھوں گا تو میرے تاثرات کیا ہوں گے اور یہ سوالات میرے ذہن میں صرف آج ہی پیدا نہیں ہوئے تھے، بلکہ شعور کے اس دَور سے جب کہ میرے دل میں پہلی بار مدینہ منورہ کی زیارت کا شوق پیدا ہوا تھا، میں انہی سوالوں کے جواب سوچا کرتا تھا۔

جدہ سے روانہ ہوتے وقت میرا خیال تھا کہ میں مسجدِ نبویؐ اور گنبدِ خضرا کی پہلی جھلک دن کی روشنی میں دیکھ سکوں گا، لیکن اب رات ہو چکی تھی۔ میں نے مسجدِ نبویؐ کے صرف وہ مینار دیکھے تھے جن پر بجلی کے قمقمے روشن تھے اور شاید قدرت کو بھی مجھ جیسے دیوانے کو اچانک ایک امتحان میں ڈالنا منظور نہ تھا۔ وضو سے فارغ ہو کر میں حیدری صاحب کے ایک رفیق شاہ دین صاحب کے ہمراہ وہاں سے نکلا۔ وہ مجھ سے بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ جماعت کھڑی ہو چکی ہے۔ آپ جلدی چلیں اور میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ میں میلوں دوڑ چکا ہوں اور میری ہمت جواب دے چکی ہے۔ چند قدم چلنے کے بعد میں بےخیالی کے عالم میں اپنے رہنما کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ مسجدِ نبویؐ میں داخل ہوتے وقت میرا ذہن ان دُعاؤں اور مناجاتوں سے خالی تھا جو دیارِ حبیبؐ کے تصور سے میری زبان پر آجایا کرتی تھیں۔ شاہ صاحب نے مجھے نمازیوں کی ایک صف میں کھڑا کر دیا، لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میں مسجد کے کس حصے میں ہوں۔ نماز کے بعد میں دیر تک بےحس و حرکت بیٹھا رہا۔ جب شاہ دین صاحب میری طرف متوجہ ہوئے تو میں نے اُن سے پوچھا "گنبدِ خضرا کس طرف ہے؟"

انھوں نے آہستہ سے جواب دیا "اپنے دائیں ہاتھ دیکھو۔ تم اس آقائے مدنیؐ کے پائے مبارک کی طرف بیٹھے ہو۔ میں تمھیں عمداً یہاں لایا تھا۔"

میں نے اپنے جسم میں ایک کپکپی محسوس کی اور میری نگاہیں رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی جالی پر مرکوز ہوگئیں۔ اس کے بعد میں کچھ دیر کے لیے مکمل طور پر خالی الذہن تھا۔ میرے دل میں کوئی آرزو نہ تھی اور میری زبان پر کوئی دُعا نہ تھی، وہ احساسات جن کے اظہار کے لیے میں کچھ دیر پہلے چیخوں کی ضرورت محسوس کرتا تھا، مکمل طور پر دب چکے تھے۔ میری بہترین دُعائیں مستجاب ہو چکی تھیں اور عزیز ترین آرزوئیں پوری ہو چکی تھیں اور میں ایک ایسا اطمینان محسوس کر رہا تھا جس سے میری رُوح نا آشنا تھی۔ روضۂ اطہر کی جالی مجھ سے اتنی قریب تھی کہ میں اسے چھُو سکتا تھا، لیکن اس دربار میں ادب کے تقاضے کچھ اور تھے

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

اس مقام کی عظمت کا احساس میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد میں اچانک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دیر تک درود و سلام پڑھتا رہا۔ اس کے بعد شاہ دین صاحب مجھے روضۂ اطہر کی دوسری جانب مسجد کے اس حصے میں لے گئے جہاں عہدِ نبویؐ کی ابتدائی حدود تھیں۔ زائرین اس حصے کے ہر ستون کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ مجھے جو جگہ خالی نظر آتی تھی، وہیں نفل پڑھنا شروع کر دیتا تھا۔ اچانک محرابِ النبیؐ سے ایک نمازی اُٹھا اور میں آگے بڑھ کر وہاں کھڑا ہو گیا۔ نیت کے لیے ہاتھ اُٹھانے لگا تو دل نے آواز دی کہ تیری پیشانی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قدموں سے پیچھے رہنی چاہیے اور میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ نفل پڑھ کر فارغ ہوا تو شاہ دین صاحب نے مجھے بتایا کہ حضورؐ کی سجدہ گاہ کو محراب کی چوڑائی کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے اور اب اگر کوئی محراب کے اندر کھڑا ہو کر بھی سجدہ کرے تو بھی اس کا سر حضورؐ کے قدموں سے آگے نہیں بڑھے گا۔

اب نفل پڑھنے کے سوا رات کو میرا کوئی پروگرام نہ تھا، لیکن معلوم ہوا کہ مسجد کے دروازے بند ہونے والے ہیں۔ اچانک مجھے حیدرالحیدری صاحب نظر آگئے اور میں نے ان سے روضۂ اطہر پر سلام پڑھوانے کی درخواست کی۔ وہ میرے ساتھ چل دیے۔ اب لوگوں کا ہجوم قدرے کم ہو چکا تھا۔ حیدری صاحب کے لہجے میں ایک عرب کا سوز و گداز تھا۔ بعض احساسات جو ابھی تک میرے دل کی گہرائیوں میں دبے ہوئے تھے، آہستہ آہستہ اُبھرنے لگے۔ میں اس آقا کے دربار میں کھڑا تھا جس کے غلاموں کی عظمت کی داستانیں میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ تھیں۔ دبے ہوئے احساسات آنسو بن کر بہہ نکلے، لیکن جذبات کے انتہائی ہیجان میں بھی میں اس خیال سے اپنی سسکیاں ضبط کر رہا تھا کہ یہاں آواز نکالنا بے ادبی ہے۔ حضورؐ کو درود و سلام پڑھنے کے بعد میں نے باری باری سیّدنا ابوبکر صدیق اور سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہم کو سلام پڑھا جو اسی روضۂ اطہر میں آسودۂ خواب ہیں۔ پھر مقام جبریلؑ پر کھڑے ہو کر دعائیں مانگیں اور مسجدِ نبویؐ سے باہر نکل آیا۔ میں نے مسجدِ نبویؐ کے قریب ہی ایک خوب صورت ہوٹل قصر المدینہ میں کمرہ لے لیا اور حیدری صاحب کے دفتر سے اپنا سامان اٹھوا کر وہاں لے آیا۔ شاہ دین صاحب کچھ دیر میرے پاس بیٹھے رہے۔ یہ بزرگ لاہور کے رہنے والے ہیں اور کوئی دس سال سے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں۔ ان کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ میرے محترم بزرگ چودھری فتح محمد بٹالوی صاحب جدہ کی طرح مدینہ میں بھی اپنے احباب کو میری آمد کی اطلاع دے چکے ہیں۔

چودھری فتح محمد صاحب اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جو تقریباً ہر سال حج کے لیے جایا کرتے ہیں۔ لاہور سے روانگی کے وقت میں نے حجازِ

مقدس کے سفر کے متعلق چودھری صاحب سے ہدایات لینے کی کوشش کی تھی، لیکن بدقسمتی سے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ جب میں تہران پہنچا تو پاکستانی سفارت خانے کی معرفت مجھے ان کی طرف سے ایک لفافہ موصول ہوا، جس میں بعض حضرات کے نام تعارفی خطوط تھے۔ اس کے علاوہ چودھری صاحب نے اس احتمال کے پیشِ نظر کہ شاید تہران میں ان کا خط مجھے نہ مل سکے، براہِ راست بھی ان حضرات کو میرے متعلق اطلاع بھیج دی تھی۔

اگلے دن مسجدِ نبویؐ میں نمازِ فجر ادا کرنے اور روضۂ اطہر پر درود و سلام پڑھنے کے بعد میں نے وادیٔ یثرب کی سیاحت شروع کی۔ چونکہ مدینہ منورہ میں میں رات کے وقت داخل ہوا تھا، اس لیے میری پہلی خواہش یہ تھی کہ شہر کی سیاحت شروع کرنے سے پہلے آس پاس کے اہم مقامات اچھی طرح دیکھ لوں۔

میں ابتدا ہی میں یہ لکھ چکا ہوں کہ اپنی آئندہ تصنیف "قیصر و کسریٰ" کے سلسلہ میں میرے لیے وادیٔ یثرب کے قدرتی خدوخال دیکھنا ضروری تھا۔ حیدری صاحب بارہ بجے تک کہیں اور مصروف تھے، تاہم انھوں نے اپنا ایک ساتھی میری رہنمائی کے لیے بھیج دیا۔ میں نے ٹیکسی لے کر قبا کا رُخ کیا۔ سرسبز نخلستانوں کے درمیان یہ آبادی مدینہ سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ ہجرت کے وقت مدینہ کے مضافات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ اسی بستی میں قیام فرمایا تھا اور حضورؐ نے اپنے قیام کے دوران میں اپنے دستِ مبارک سے جس مسجد کی بنیاد رکھی تھی، اسے مسجدِ قبا کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں اس مسجد سے متعلق یہ ارشاد ہے :

"وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے

اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو! اس
میں ایسے لوگ ہیں، جن کو صفائی بہت پسند ہے اور خدا
صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

اس مسجد کی عظمت اور تقدیس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس کی تعمیر کے وقت حضورؐ اپنے ہاتھوں سے بھاری پتھر اُٹھاتے تھے۔ یہاں تک کہ بوجھ سے آپؐ کا جسمِ مبارک خم ہوجاتا تھا۔ عقیدت مند آتے اور عرض کرتے "ہمارے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، یہ بوجھ ہمارے لیے چھوڑدیں۔" آپؐ ان کے اصرار پر ایک پتھر چھوڑ دیتے، لیکن پھر اسی وزن کا دوسرا پتھر اُٹھا لیتے۔

مسجد قبا کی زیارت کے بعد میں نے جبلِ اُحد کا رُخ کیا۔ یہ پہاڑ آس پاس کے پہاڑوں میں سب سے بلند دکھائی دیتا ہے اور اسی کے دامن میں وہ مقام ہے، جہاں اُحد کی جنگ لڑی گئی۔ عمِ رسول حضرت حمزہؓ اور دوسرے شہدا اسی جگہ دفن ہیں اور ان شہداؑ کی قبروں کے نشانات کے قریب ہی صاف و شفاف پانی کا ایک چشمہ بہتا ہے، جس سے آس پاس کے نخلستان سیراب ہوتے ہیں۔ احد کے میدان سے میں نے مسجد قبلتین کا رُخ کیا۔ یہ وہ مسجد ہے جہاں نماز پڑھتے وقت حضورؐ کو قبلہ بدلنے یعنی بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کا رُخ کر کے نماز ادا کرنے کی ہدایت ہوئی تھی۔ اس مسجد میں اُس محراب کا نشان اب بھی موجود ہے، جس کا رُخ بیتُ المقدس کی طرف تھا۔

خمسہ مساجد

مسجد قبلتین سے واپسی پر میں نے اس مقام پر حاضری دی، جہاں

غزوۂ خندق کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے خیمے نصب تھے۔ ترکوں نے وہاں پانچ مسجدیں تعمیر کروادی تھیں۔ ان مساجد کی زیارت سے فارغ ہوکر میں پاس ہی ایک پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ کچھ دیر اردگرد کے مناظر دیکھنے کے بعد شہر کی طرف واپس چل پڑا۔ مسجد نبوی میں ظہر کی نماز سے فارغ ہوا تو حیدر الحیدری صاحب اور شاہ دین صاحب مل گئے، وہ مجھے موٹر پر بٹھا کر مدینہ سے باہر وادیِ خاکِ شفا لے گئے۔ موٹر ایک چھوٹے سے مکان کی چار دیواری کے باہر رُکی۔ میرے استفسار پر حیدری صاحب نے بتایا کہ یہ شاہ دین صاحب کا نیا مکان ہے اور وہ آباد ہونے سے پہلے کسی مہمان کا انتظار کر رہے تھے۔ اس میدان کو خاکِ شفا کا میدان اس لیے کہا جاتا ہے کہ جنگِ اُحد سے واپس آکر حضورؐ کے حکم سے زخمیوں نے اس میدان کی مٹی اپنے زخموں پر ڈالی تھی اور وہ اچھے ہوگئے تھے۔ میں نے شاہ دین صاحب کو مبارک باد دی اور اس مکان میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اُن باغات کی طرف روانہ ہوگیا جن کے ساتھ فخر الانبیاءؐ کی یادیں وابستہ تھیں۔ چند نخلستانوں میں سے گزرنے کے بعد ہم اس باغ میں داخل ہوئے، جو بوستانِ حضرت سلمان فارسیؓ کے نام سے مشہور ہے۔ اس باغ کے کنوؤں میں ٹیوب ویل لگا ہوا تھا اور ٹھنڈا میٹھا اور شفاف پانی کیاریوں کو سیراب کر رہا تھا۔ میرے رہنماؤں نے اس باغ کی تعریف کرتے ہوئے بتایا کہ حضرت سلمان فارسیؓ تلاشِ حق کے لیے ایران سے نکلے اور مدینہ کے یہودی تاجروں کے ایک قافلہ کے ساتھ یہاں تشریف لے آئے۔ قافلہ والوں نے انھیں غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ جب حضورؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو حضرت سلمانؓ نے جمالِ نبوت کی پہلی جھلک دیکھ کر اسلام قبول کر لیا۔ یہودی نے آپ کو رہا کرنے کے عوض چالیس

اوقیہ سونا ادا کرنے کے علاوہ کھجور کے تین سو پودے لگانے کی شرط پیش کی۔ حضورؐ نے صحابہؓ سے پودے حاصل کیے اور سلمانؓ کو گڑھے کھودنے کا حکم دیا۔ جب گڑھے تیار ہو گئے تو حضورؐ نے اپنے دستِ مبارک سے یہ پودے لگائے۔ ایک صحابیؓ نے چالیس اوقیہ سونا بھی ادا کر دیا اور سلمان فارسیؓ آزاد ہو گئے۔

اس باغ کے مالی نے ہمیں دو درخت دکھائے، جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حضورؐ کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے درختوں کے بیج سے ہیں۔ رخصت کے وقت باغ کے مالی نے تبرک کے طور پر ان درختوں کی کھجوریں بھی پیش کیں۔ اس کے بعد ہم نے پاس ہی دو اور کنوئیں دیکھے۔ یہ کنوئیں مدینہ کے ان سات قدیم کنوؤں میں سے ہیں، جنھیں متبرک سمجھا جاتا ہے۔ ان کنوؤں کے گرد جو باغ ہیں، ان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ حضورؐ گرمیوں کی دوپہر میں کبھی کبھی یہاں استراحت فرمایا کرتے تھے۔

ایک کیاری میں گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ مالی نے، جو حیدری صاحب کا دوست تھا، ہمارا خیر مقدم کیا اور گلاب کے پھولوں کی جھولی بھر کر پیش کر دی۔ میں ان خشک پھولوں کی پتیاں کئی دوستوں میں تقسیم کر چکا ہوں۔

یہاں سے واپسی پر مجھے مسجدِ نبویؐ کے آس پاس وہ مقامات دکھائے گئے جہاں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے مکانات تھے۔ بابِ جبرئیل کے سامنے چند قدم کے فاصلہ پر میزبانِ رسولؐ حضرت ایوب انصاریؓ، جن کا ذکر استنبول کے سلسلہ میں آ چکا ہے، کا مکان ہے۔ جب میں نے پہلی بار یہ مکان دیکھا تو اس کا دروازہ بند تھا، لیکن اگلی صبح شاہ دین صاحب کے ہمراہ

وہاں گیا تو یہ مکان کھلا تھا۔ گلی کے دروازے سے جو پہلا کمرہ ہمیں دکھائی دیا، اس کے اندر ایک میز پر سینے کی مشین کے علاوہ کچھ سلے ہوئے اور کچھ کٹے ہوئے پارچات رکھے تھے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ کپڑے سینے والا ابھی کہیں اٹھ کر گیا ہے۔ شاہ دین صاحب بے دھڑک اندر داخل ہو گئے اور میری ہچکچاہٹ دیکھ کر بولے "بھئی مکان کے مالک اوپر رہتے ہیں۔ آپ اطمینان سے اندر تشریف لے آئیں۔" میں ان کے پیچھے اس کمرہ سے گزر کر ایک کشادہ دالان میں داخل ہوا۔ کچے فرش پر گرد جمی ہوئی تھی اور ایک طرف کھجور کی ایک ٹوٹی ہوئی چٹائی کا کچھ حصہ پڑا تھا۔

اس مکان کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے زمانے میں اس کا نقشہ کیا تھا۔ بہرحال یہ وہ مبارک جگہ تھی، جہاں حضورؐ نے سات مہینے قیام فرمایا تھا۔ حضرت ابوایوبؓ کے ایثار و خلوص کا یہ عالم تھا کہ گھر میں جو کچھ پکتا تھا، وہ حضورؐ کی خدمت میں بھیج دیتے اور جو کچھ وہاں سے بچا ہوا واپس آتا تھا، اسے وہ اور ان کی زوجہ تناول فرماتی تھیں۔ کھانے میں جہاں جہاں آنحضرتؐ کی انگلیوں کا نشان نظر آتا تھا، حضرت ابوایوبؓ تبرکاً وہیں سے لقمہ اٹھاتے تھے۔ آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کے لیے اپنے مکان کی بالائی منزل پیش کی تھی، لیکن حضورؐ نے ملاقات کے لیے حاضری دینے والوں کی آسانی کے لیے نیچے کا حصہ پسند فرمایا۔ ایک دن اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا تو میزبانِ رسولؐ کو اندیشہ ہوا کہ پانی بہہ کر نیچے نہ چلا جائے۔ آپؓ نے پانی جذب کرنے کے لیے اپنا لحاف اوپر ڈال دیا اور ساری رات بیٹھ کر کاٹی۔

اسی مکان کے قریب وہ عالی شان مکان ہے، جو سعودی حکومت

نے غلام محمد (مرحوم) کو بحیثیت گورنر جنرلِ پاکستان بطور تحفہ دیا تھا، لیکن مرحوم اسے اپنی ذاتی ملکیت بنا کر چھوڑ گئے ہیں۔ مدینہ میں جو پاکستانی مجھ سے ملے، انھوں نے بتایا کہ مرحوم کے وارثوں نے کچھ عرصہ قبل اسے کرایہ پر دے رکھا تھا اور اب شاید اسے بیچنے کی فکر میں ہیں۔ یہ صورت حال افسوس ناک ہے۔ اوّل تو مسٹر غلام محمد کے لیے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ اس مکان کو، جو انھیں بحیثیت گورنر جنرلِ پاکستان بطور تحفہ ملا تھا، اپنی ذاتی ملکیت بناتے۔ پھر اگر انھوں نے ایسا کیا بھی تھا، تو اس کا مصرف ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، جسے پاکستان کے وقار کے منافی سمجھا جائے۔ یہ مکان روضۂ اطہر کے بالکل قریب ہے اور جو پاکستانی مجھے وہاں ملے تھے، وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ اگر اسے مسٹر غلام محمد کے وارث بیچنا چاہیں تو پاکستانی حکومت کو اسے خرید کر پاکستانی حاجیوں کے آرام کے لیے یا کسی اور کارِ خیر کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔

نورالدین زنگیؒ ان عظیم فرمانرواؤں میں سے ایک تھا، جن کے کارناموں پر عالمِ اسلام فخر کر سکتا ہے۔

اہلِ مدینہ جب محبانِ رسولؐ کا ذکر کرتے ہیں تو نورالدین علیہ الرحمۃ کا نام نہیں بھولتے۔ یہاں ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا :

ایک رات آپ مدینہ سے کوسوں دور اپنے محل میں سو رہے تھے کہ خواب میں آقائے مدنیؐ کی زیارت ہوئی۔ حضورؐ نے فرمایا "نورالدین! دو آدمی ہمیں تنگ کر رہے ہیں۔"

آپ کانپتے ہوئے اُٹھے، وضو کیا، نفل پڑھے اور دوبارہ لیٹ

گئے۔ آپ نے دوسری بار پھر یہی خواب دیکھا تو زیادہ پریشانی ہوئی اور آپ اُسی طرح باوضو ہو کر استغفار پڑھنے کے بعد دوبارہ لیٹ گئے۔

تیسری بار خواب کی حالت میں حضورؐ تشریف لائے اور نورالدین کو دو آدمیوں کی شکلیں دکھانے کے بعد فرمایا :

"یہ لوگ ہیں جو ہمیں تنگ کر رہے ہیں۔"

نورالدین نے اپنے وزیر کو بلا کر کہا کہ اب میرے لیے کوئی حجت باقی نہیں رہی۔ میں فوراً مدینہ پہنچنا چاہتا ہوں۔

چنانچہ تھوڑی دیر بعد یہ اولوالعزم حکمران اپنے سپاہیوں کے ساتھ مدینہ کا رُخ کر رہا تھا۔

یہ فوج بھوک اور تھکن کی پروا کیے بغیر دن رات سفر کرتی ہوئی مدینہ پہنچی۔ شہر میں آمد و رفت کے تمام دروازے بند کر دیے گئے اور اہلِ شہر کو یہ حکم ہوا کہ وہ سب نورالدین علیہ الرحمۃ کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے تشریف لائیں۔

ہزاروں آدمی آئے، لیکن نورالدینؒ کی نگاہیں ان دو آدمیوں کو تلاش نہ کر سکیں، جن کی شکلیں انھیں خواب میں دکھائی گئی تھیں۔

شہر کے اکابر سے بار بار پوچھنے پر معلوم ہوا کہ دو بزرگ روضۂ اطہر کے قریب ایک مکان میں رہتے ہیں اور وہ کسی سے میل جول نہیں رکھتے، ہمیشہ ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ نورالدینؒ ان دو آدمیوں کے حُلیے دریافت کرنے کے بعد بلا توقف اس مکان پر پہنچے، جو انھوں نے ایک عرصہ سے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ نورالدینؒ انھیں دیکھتے ہی پہچان گئے۔ یہ وہی تھے جن

کی صورتیں انھوں نے خواب میں دیکھی تھیں، لیکن اہلِ مدینہ یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ یہ سفید ریش انسان کسی جرم کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ نورالدین نے ان کی گرفتاری کا حکم دے کر مکان کی تلاشی لی، مگر وہاں کوئی قابلِ اعتراض چیز نظر نہ آئی، لیکن آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس غلام کو اپنے خواب کی صداقت پر پورا یقین تھا۔

انھوں نے کئی بار مکان کا ایک ایک گوشہ دیکھا۔ بالآخر چٹائیاں اُٹھا کر فرش کا معاینہ کیا تو ایک سِل اپنی جگہ سے ہل گئی۔ سِل اُٹھائی گئی تو اندر ایک سرنگ تھی۔ سرنگ کے اندر داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ سرنگ کا دوسرا سرا روضۂ اطہر کے اندر پہنچ چکا ہے۔

ایک روایت کے مطابق روضۂ اطہر میں نقب لگانے والے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے جسدِ مبارک تک پہنچ چکے تھے اور آپؓ کا ایک پاؤں نظر آ رہا تھا۔

نورالدین زنگیؒ یہ دیکھ کر باہر نکلے تو ان کی حالت یہ تھی کہ وہ بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ حضورؐ نے ایسے وقت میں اس غلام کو یاد فرمایا۔

گرفتار ہونے والے دونوں مُجرم یہودی تھے اور دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ وہ حضورؐ کے جسمِ اطہر کو روضۂ اقدس سے نکال کر لے جانے کا منصوبہ بنا کر آئے تھے۔ دن کی روشنی میں لوگوں پر اپنے زہد و تقویٰ کا رُعب بٹھاتے تھے اور رات کے وقت سرنگ کھودتے اور اس کی مٹی مشکیزوں میں ڈال کر کہیں باہر پھینک آتے تھے۔

مجرم قتل کر دیے گئے اور روضۂ اطہر کو آیندہ کے لیے ایسی سازشوں سے بچانے کے لیے نورالدینؒ نے چاروں اطراف زمین کے اندر سیسے کی مضبوط

دیوار بنا دی۔

جنّت البقیع

یہ مدینۂ منورہ کا قبرستان ہے۔ یہاں کئی صحابۂ کرامؓ، صلحائے اُمت اور بزرگانِ دینؒ آسودۂ راحت ہیں۔ کئی قبروں پر قبّے بنے ہوئے تھے لیکن اب ان کا کوئی نشان باقی نہیں رہنے دیا گیا۔ خاص خاص قبروں کے گرد کچھ سلیں یا پتھر رکھ کر حاشیے کے نشان بنا دیے گئے ہیں۔ میرے رہنما مجھے باری باری حضرت عثمانؓ، حضرت حسنؓ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت عباسؓ، امام باقرؒ، فرزندِ رسولؐ حضرت ابراہیمؑ، حضرت جعفر طیارؓ، پھر حضورؐ کی دایہ حضرت حلیمہ سعدیہؓ، اُمہات المومنینؓ اور حضورؐ کی صاحبزادیوںؓ کی قبروں پر لے گئے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور باقی اُمہات المومنینؓ کی قبریں ایک ہی احاطہ میں ہیں جس کا گنبد گرا دیا گیا تھا۔ اس کے پاس ہی حضرت فاطمہؓ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صاحبزادیوںؓ کی قبریں ہیں۔

حضرت امام مالکؒ، امام نافعؒ بھی اسی قبرستان میں دفن ہیں۔ ایک مشترک قبر شہدائے جنّت البقیع کی ہے، جو مختلف جنگوں میں زخمی ہونے کے بعد مدینہ لائے جاتے تھے اور وفات کے بعد یہاں دفن کر دیے جاتے تھے۔

جنّت البقیع میں دُعائیں اور عقیدت کے آنسو پیش کرنے کے بعد میں نے ایک بار پھر مسجدِ قبا میں جا کر نفل پڑھے اور اس کے بعد دوبارہ حیدرالحیدری اور شاہ دین صاحب کے ہمراہ مدینہ کے مضافات کی سیر کے لیے چل پڑا۔ جب میں جبلِ اُحد کے بائیں ہاتھ "حضرت عثمانؓ کے کنوئیں

کا رُخ کر رہا تھا تو راستے میں ایک شکستہ چاردیواری کے متعلق یہ بتایا گیا کہ یہاں وہ مکان ہے جس کی چھت پر کھڑے ہو کر مکہ سے حضورؐ کے وُرود پر نجار کی لڑکیوں نے دف بجا کر یہ گیت گایا تھا:

نحن جوار من بني النجار
يا حبذا محمد من جار
ہم خاندانِ نجّار کی لڑکیاں ہیں
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا اچھے ہمسایہ ہیں

اس کے قریب ہی ایک مسجد ہے، جسے مسجدِ جمعہ کہتے ہیں۔ شہر سے نکلتے وقت اسی راستے میں مسجد غمامہ آتی ہے، جہاں حضورؐ عیدین کی نمازیں ادا فرماتے تھے۔

راستے میں ایک ٹیلے پر چھوٹی سی ایک اور مسجد تھی اور کہا جاتا ہے کہ حضورؐ شام کی طرف جانے والے قافلوں کو رخصت کرنے کے لیے یہاں تک آیا کرتے تھے۔

عثمانؓ کے کنوئیں پر ٹیوب ویل لگا ہوا تھا۔ یہ وہ کنواں ہے، جو حضرت عثمانؓ نے ایک یہودی سے خرید کر عوام الناس کے لیے وقف کر دیا تھا۔ میرے استفسار پر وہاں کام کرنے والے آدمیوں نے بتایا کہ تقریباً چار سال سے یہ ٹیوب ویل مسلسل آٹھ دس گھنٹے روزانہ چلایا جاتا ہے، لیکن پانی میں کمی نہیں آتی۔

کچھ دیر عثمانؓ کے کنوئیں پر قیام کرنے کے بعد ہم لوگ واپس آ گئے اور مسجدِ نبویؐ میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد دوسری طرف مدینہ سے کوئی بارہ چودہ میل دُور ایک جھیل دیکھنے چلے گئے۔ یہ جھیل اب خشک ہو چکی ہے اور اس کی ایک جانب دُور تک نسبتاً ہلکے وزن کے سیاہ پتھر بکھرے ہوئے ہیں،

جنھیں دیکھ کر بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی زمانے میں آس پاس کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹا ہو گا۔ اس خشک جھیل کی وسعت اور گہرائی دیکھ کر میں یہ سوچ رہا تھا کہ جن ادوار میں یہ پانی سے لبریز ہوتی ہو گی تو اس سے سیراب ہونے والی زمینوں کی زرخیزی کا کیا عالم رہا ہو گا۔

مدینہ اور اہلِ مدینہ

اب وادیِ یثرب کے سرسبز و شاداب حصے کی انتہائی حدود کے گرد چکر لگانے کے بعد میری ساری توجہ مدینہ اور اہلِ مدینہ کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔

وہ شہر جس کے باشندوں کو سرورِ کونینؐ کی میزبانی کا شرف عطا ہوا ہے اور جس کی سربلندی و خوش حالی کے لیے حضورؐ نے دعائیں مانگی ہیں، کسی تعریف و توصیف کا محتاج نہیں۔ گزشتہ چودہ صدیوں میں ہر سال اطرافِ عالم سے لاکھوں مسلمان اس شہر کی زیارت کے لیے آتے رہتے ہیں اور عالمِ اسلام پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا، جب کہ ہزاروں انسان بارگاہِ الٰہی میں مدینہ کی زیارت سے مشرف ہونے کی دعائیں نہیں کرتے۔

یہ احساس کسی نہ کسی حد تک ہر مسلمان کے دل میں موجود رہا ہے کہ اس کی رُوح کی آخری پیاس مدینہ کے سوا کہیں اور نہیں بجھ سکتی۔ یہ وہ شہر ہے جہاں داخل ہوتے ہی کسی کو اجنبیت کا احساس نہیں رہتا، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے بعض مناظر پہلے بھی دیکھ چکا ہے، اس کی گلیوں اور بازاروں میں پھر چکا ہے اور اس کی فضا میں سانس لے چکا ہے۔

"کب اور کیسے؟"

یہ سوالات اسے پریشان نہیں کرتے!

میں دُنیا کے انتہائی پر رونق شہر دیکھ چکا ہوں اور اپنی آبادی، اپنے مادی وسائل اور ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے مدینہ غیر معمولی شہر نہیں لیکن اگر مکینوں کی آسودگی اور قناعت اور ان کے دلوں کی وُسعت کسی شہر کو بزرگی اور برتری عطا کر سکتی ہے تو اس لحاظ سے مدینۃ النبیؐ روئے زمین کا پہلا اور آخری شہر ہے۔

اپنی وضع داری، خوش اخلاقی، خوش گفتاری اور وسیع النظری کے اعتبار سے اہلِ مدینہ عالمِ اسلام سے ہی نہیں، بلکہ عرب کے باقی باشندوں سے بھی مختلف نظر آتے ہیں۔

آج جب کہ وقت کی رفتار نے ابنائے آدم کو ایک اضطراری اور سیمابی کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے، مدینے کے باشندے ایک قابلِ رشک سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں۔ اس قسم کی مثال شاید کسی اور شہر میں نہیں ملے گی کہ ایک جگہ ساتھ ساتھ دو دکانیں ہیں، ایک دکان پر یکے بعد دیگرے دو گاہک آتے ہیں اور سودا لے کر چلے جاتے ہیں۔ جب تیسرا گاہک بھی اسی دکان پر آتا ہے تو وہ دکان دار محسوس کرتا ہے کہ اس کے پڑوسی کے یہاں کوئی بکری نہیں ہوئی اور وہ گاہک سے درخواست کرتا ہے کہ آپ مطلوبہ چیز وہاں سے خرید لیں۔ ہمارے نرخ ایک جیسے ہیں۔

لوگوں کی خوش اخلاقی کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی بات پر قہقہہ لگانا تو درکنار بلند آواز سے بولنا بھی معیوب سمجھتے ہیں۔ روضۂ اطہر کے آس پاس تو میں نے یہ حالت دیکھی ہے کہ لوگ پاسِ ادب سے سرگوشی کے انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔

کسی سے راستہ پوچھیے تو وہ آپ کے ساتھ چل پڑے گا۔ مدینہ کا ہر چھوٹا بڑا مسافروں کی دلجوئی اور خدمت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔

مدینہ میں کھانے پینے کی اشیا کی کوئی کمی نہیں اور میں اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ شہر مشرقِ وسطیٰ کے تمام شہروں سے ارزاں ہے۔ پھل جس طرح جدہ اور مکہ معظمہ میں مل سکتا ہے، یہاں بھی ملتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے تمام شہروں میں تازہ دُودھ کی بے حد کمی ہے، لیکن مدینہ میں اس کی ضرورت کے مطابق یہ نعمت بھی موجود ہے۔ دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ مدینے کی بکریاں کافی مقدار میں دودھ دیتی ہیں اور ان کی خوراک کا مسئلہ بھی اہلِ مدینہ کے لیے چنداں پریشان کن نہیں۔ مدینہ کے نخلستانوں میں کھجوریں بہت ہوتی ہیں۔ لوگ کھجوریں خود کھاتے ہیں اور اُن کی گٹھلیاں پیس کر بکریوں کے آگے ڈال دیتے ہیں۔

اہلِ مدینہ کو پاکستان کے مسلمانوں کے ساتھ وہی دلچسپی ہے، جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ پاکستان سے جو حضرات یہاں آ کر سکونت پذیر ہو گئے ہیں، انھوں نے اپنے اخلاق و اطوار سے اہلِ مدینہ پر بہت اچھا اثر ڈالا ہے۔ مجھے وہاں ایسے پاکستانیوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہُوا، جو بالالتزام روضۂ اطہر پر جا کر پاکستان کی ترقی اور اس کی خوشحالی کے لیے دُعائیں مانگتے ہیں۔ جدہ اور مکہ معظمہ کی طرح مدینہ میں بھی پاکستان کی ایک ڈسپنسری ہے اور اس ڈسپنسری کے انچارج اپنے زہد و تقویٰ اور جذبۂ خدمتِ خلق کے باعث وہاں بہت مقبول ہیں۔

یہاں بعض پاکستانیوں نے اپنی ایک پریشانی بیان کی اور وہ یہ تھی کہ

بعض لوگوں کے پاسپورٹ کی مدت ختم ہو رہی تھی اور حکومت پاکستان کے کسی نئے قاعدے کی رُو سے پاسپورٹ کی تجدید کے لیے پانچ سو رُوپے بطورِ ضمانت جمع کرانا ضروری تھا۔ مدینہ اور دوسرے شہروں میں ان پاکستانیوں کی خاصی تعداد موجود ہے جو محنت مزدوری کر کے گزر اوقات کر رہے ہیں اور ان کی سب سے بڑی تسکین یہی ہے کہ قدرت نے انھیں دیارِ پاک میں رہنے کا موقع عطا کیا ہے۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں، جو اگر انتہائی کوشش کریں تو بھی پاسپورٹ کی تجدید کے لیے رقم ادا نہیں کر سکتے اور پاسپورٹ کی تجدید نہ ہو سکنے کی صورت میں ان کے لیے یہی چارۂ کار رہ جائے گا کہ وہ واپس اپنے وطن آ جائیں۔

عرب میں یہ لوگ پاکستانی حکومت کے لیے کوئی بوجھ نہیں ہیں، لیکن یہاں واپس آ کر وہ یقیناً ایک مسئلہ بن جائیں گے اور یہ معاملہ حکومت کی ہمدردانہ توجہ کا مستحق ہے۔

مدینہ سے روانگی

۲۰ نومبر کو مجھے معلّم حیدر الحیدری صاحب نے اپنے مکان پر ایک پُرتکلف دعوت دی۔ مدینہ میں مقیم پاکستانیوں کو خاص طور پر اس میں مدعو کیا گیا۔

اگلے دن دس بجے کے قریب میں ٹیکسی میں اپنا سامان رکھوانے کے بعد آخری بار مسجد نبویؐ میں داخل ہوا۔ روضۂ اطہر پر حاضری دی اور الوداعی سلام کیا۔ وہاں اُلٹے پاؤں رُک رُک کر قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ کچھ دیر صحن میں رُک کر روضۂ اطہر کے سبز گنبد کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ آنسوؤں کے پردے میری نگاہوں کے سامنے حائل ہوتے گئے۔ میں نے

ہاتھ اٹھا کر آخری بار دُعا کی اور باہر نکل آیا۔

مجھے اس وقت کے احساسات کی ترجمانی کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں نے ساری عمر وہاں گزاری ہوتی تو میری کیفیت اس سے مختلف نہ ہوتی۔

موٹر پر سوار ہونے کے بعد میں مُڑ مُڑ کر گنبدِ خضرا کی طرف دیکھ رہا تھا اور میری زبان پر یہ شعر تھا ؎

طور مَوجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش

بدر کا میدان

مدینہ سے واپسی پر بدر کا میدان میرے راستے کی اہم ترین منزل تھا۔ مدینہ سے جدہ کی طرف کوئی ایک تہائی فاصلہ طے کرنے کے بعد اس مقام تک پہنچنے کے لیے دائیں ہاتھ کچے راستے پر کوئی ڈیڑھ یا دو میل چلنا پڑتا ہے۔ شہدائے بدر کی قبروں سے تقریباً تین فرلانگ دُور ڈرائیور نے کار روک دی اور میں وہیں اپنا جُوتا اُتار کر ایک مقامی معلّم کے ساتھ آگے چل دیا۔ یہ ریتلا میدان بلند اور سنگلاخ چٹانوں کے دامن میں واقع ہے اور یہاں ایک مشترکہ قبر میں وہ شہدا آسودۂ خواب ہیں، جنھوں نے ظلمت کدۂ عالم میں اپنے خون سے چراغ جلائے تھے۔ یہ مشترکہ قبر ایک مربع نما فرش ہے، جس کے گرد ایک پختہ حاشیہ بنا ہُوا ہے۔

مجاہدینِ بدر کی عظمت کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ تین سو تیرہ جانباز سر پر کفن باندھے مشرکینِ مکّہ کے مقابلے کے لیے نکلے تھے تو آقائے دوجہاں نے یہ فرمایا تھا کہ آج پورا اسلام پورے کُفر کے مقابلے میں جا رہا ہے اور شہدائے بدر کی تعریف اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ صفحۂ ہستی پر اسلام کی قسمت کا فیصلہ ان کے خون کی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔

اب مجھے یاد نہیں کہ جب میں بدر کے میدان میں کھڑا تھا تو میری دُعا کے الفاظ کیا تھے، تاہم میرے تاثرات یہی تھے:

"بدر کے غازیو اور شہیدو! تم پر خدا کی لاکھ لاکھ رحمتیں ہوں۔ اس دُنیا میں حق کے متلاشیوں کی گردنیں تا قیامت تمھارے احسانات کے بوجھ سے جھکی رہیں گی۔ تم نے کفر کی ظلمتوں میں جو قندیلیں روشن کی تھیں وہ قیامت تک انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلوں کو سلامتی کا راستہ دکھلاتی رہیں گی۔ تم نے اپنے خون سے جس درخت کی آبیاری کی تھی، اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کرنے والے ان گنت انسان ہمیشہ تمھیں تشکّر کے آنسو پیش کرتے رہیں گے۔"

اس میدان کے پاس ہی میں نے "مسجدِ عریش" میں ظہر کی نماز ادا کی اور وہاں سے چل دیا اور غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے جدّہ پہنچ گیا۔

میں نے ۳ جنوری کو ظہران جانے کے لیے سعودی عرب ایرلائنز کے طیارے پر اپنی سیٹ بُک کرا رکھی تھی اور جدّہ سے خروج کا ویزا حاصل کرنے کے لیے میرا وہاں ایک دن پہلے پہنچنا ضروری تھا۔ رات کے وقت میں نے چودھری علی اکبر صاحب کے یہاں قیام کیا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ قاضی

نذیر احمد صاحب جو راولپنڈی کے مشہور و معروف وکیل ہیں، عمرہ کے لیے آ رہے ہیں اور تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائیں گے۔

اب میرا پروگرام یہ تھا کہ قاضی صاحب کے آتے ہی ہم مکّہ کی طرف روانہ ہو جائیں اور یہ رات وہاں گزاری جائے، لیکن قاضی صاحب جنھیں شام کے وقت پہنچنا تھا، آدھی رات سے کچھ دیر بعد پہنچے اور مجھے مکّہ جا کر ایک اور عمرہ کرنے کا پروگرام اگلے دن پر ملتوی کرنا پڑا۔ چنانچہ اگلے دن خروج کا ویزا لینے کے بعد میں قاضی نذیر احمد صاحب کے ہمراہ مکّہ روانہ ہو گیا۔ جدّہ سے مکّہ کا فاصلہ کوئی چالیس میل کے قریب ہے۔

مجھے جدّہ پہنچتے ہی چودھری صاحب کی زبانی یہ اطّلاع مل چکی تھی کہ مولانا مودودی مکّہ پہنچ چکے ہیں اور اسی مکان میں قیام پذیر ہیں جہاں مجھے ٹھہرایا گیا تھا۔ میں نے مکّہ پہنچ کر عمرہ کیا اور اس کے بعد عصر کی نماز سے فارغ ہو کر مولانا سے ملاقات کی۔ مولانا مودودی عرب، شام اور مصر کی سیاحت پر آئے ہوئے تھے اور آپ کے سفر کا مقصد ان شہروں اور بستیوں کے متعلق تاریخی اور جغرافیائی معلومات حاصل کرنا تھا، جن کا ذکر قرآنِ حکیم میں آیا ہے۔

قاضی نذیر احمد صاحب مکّہ میں رُک گئے اور میں غروبِ آفتاب سے تھوڑی دیر بعد جدّہ پہنچ گیا۔ رات کے وقت ڈاکٹر مغربی کے یہاں ہماری دعوت تھی۔ دسترخوان مشرق و مغرب کے تمام تکلفات سے آراستہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب ان میزبانوں میں سے ہیں، جنھیں ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ ان کے مہمانوں نے کم کھایا ہے۔ بذاتِ خود بہت کم کھاتے ہیں، لیکن مہمانوں کو زیادہ کھلانے پر اصرار کرتے ہیں۔

مجھے پچھلے پہر جدّہ سے روانہ ہونا تھا اور میں جلد سو جانا چاہتا تھا،

لیکن یہ محفل ایسی تھی کہ وہاں سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ تقریباً گیارہ بجے ہم نے اپنے میزبان سے اجازت لی اور کوئی چار بجے کے قریب میں ہوائی اڈے کا رُخ کر رہا تھا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ طیارے کی روانگی میں ابھی کافی وقت ہے۔ ہوائی کمپنیوں کے مقامی ایجنٹ مسٹر روہیلہ جو ایک پاکستانی نوجوان ہیں ہمیں چائے پلانے کے لیے اپنے مکان پر لے گئے۔ طلوعِ آفتاب کے وقت ہمارے طیارے نے جدّہ سے پرواز کی۔ میرے ساتھ کراچی کے دو تاجر بھی تھے۔

سعودی عرب ایرلائنز کے تقریباً تمام جہاز ڈکوٹا ہیں اور بعض مسافر اس پر سفر کرنے سے گھبراتے ہیں، لیکن دنیا میں شاید یہ واحد ہوائی سروس ہے جسے آج تک کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

سعودی عرب ایرلائنز کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن مجھے چودھری علی اکبر صاحب نے بتایا تھا کہ اس ہوائی سروس کا افتتاح کرنے سے پہلے شاہ ابن سعود مرحوم حرم میں گئے اور انھوں نے غلافِ کعبہ پکڑ کر انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ یہ دُعا مانگی: "یا اللہ! میں ہوائی جہازوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ میں صرف تیری اعانت کے بھروسے پر یہ خطرہ مول لے رہا ہوں۔ اب تو ہی ان کا حامی و ناصر ہے۔" سعودی عرب کے ہر طیارے پر کلمۂ طیبہ لکھا ہوا ہے۔

ہمارا جہاز کچھ دیر کے لیے ریاض کے ہوائی اڈے پر اُترا۔ نجد کے صحرا میں سعودی عرب کا یہ دارالحکومت اب ایک اچھا خاصا شہر معلوم ہوتا ہے۔

ہم ہوائی جہاز سے باہر نکلے تو انتہائی سرد ہوا کے تند و تیز جھونکوں نے ہمارا استقبال کیا۔ میرے خیال میں اس صحرا کی سردی ان دنوں بھی راولپنڈی کی جنوری کی سردی سے کم نہیں ہوگی۔ ریاض سے پرواز کے بعد ہم بارہ بجے کے قریب ظہران پہنچ گئے۔ وہاں الخبر کی آبادی میں راؤ اختر صاحب سے ملاقات ہوئی

اور تھوڑی دیر میں چند پاکستانی نوجوان جو مجھے جانتے تھے، وہاں جمع ہو گئے۔ ہمیں اگلے روز کراچی کے لیے پرواز کرنا تھا۔

میں نے اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ رات کو راؤ اختر صاحب کے یہاں قیام کیا۔ یہ شگفتہ مزاج نوجوان راؤ خورشید صاحب کے بھتیجے اور ظہران میں مقیم پاکستانیوں کے روحِ رواں ہیں۔ حج کے ایام میں ظہران کے راستے آنے جانے والے پاکستانیوں کی خبرگیری اور خدمت ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

اگلے دن کوئی دو بجے ہم ظہران میں اپنے میزبانوں کو خدا حافظ کہنے کے بعد "کے۔ ایل۔ ایم" کے طیارہ پر سوار ہوئے اور چند گھنٹوں کے بعد کراچی پہنچ گئے اور میرا ایک ماہ کا طویل سفر ختم ہوا۔

پاکستان سے روانہ ہوتے وقت تہران میں مجھے ایک اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے چند دن قبل مسٹر روہیلہ کی معرفت "کے۔ ایل۔ ایم" کے طیارہ پر ظہران سے کراچی کی سیٹ بُک کروائی تھی اور وہ جدّہ سے تہران میں "کے۔ ایل۔ ایم" کے دفتر کو تار بھیج چکے تھے۔

میں ہوائی جہاز سے اُترتے ہی سیدھا "کے۔ ایل۔ ایم" کے دفتر میں پہنچا اور وہاں سے اپنی سیٹ کے متعلق پوچھا۔ متعلقہ افسر نے جواب دیا کہ ہم نے آپ کی سیٹ کے لیے قاہرہ تار بھیج دیا ہے، لیکن ابھی تک وہاں سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔ قاہرہ سے کل یہاں پہنچنے والے ہوائی جہاز پر کئی اور مسافر کراچی جا رہے ہیں اور وہ آپ سے بہت پہلے ہمیں اطلاع دے چکے ہیں لیکن ان میں سے بھی بعض ایسے ہیں، جن کی سیٹوں کے متعلق قاہرہ سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔ ان مسافروں کا نمبر آپ سے پہلے آتا ہے، اس لیے جو سیٹیں اتفاقاً خالی ہوں گی، وہ انھیں ملیں گی اس کے بعد آپ کی باری

گی، ورنہ "کے۔ ایل۔ ایم" کا دوسرا طیارہ ایک ہفتہ بعد یہاں سے روانہ ہوگا۔

کراچی کے دو تاجر جو جدہ سے میرے ساتھ آئے تھے، وہ بھی اسی صورتِ حال کا سامنا کر رہے تھے۔ صرف اتنا فرق تھا کہ اُن کا نمبر میرے بعد آتا تھا۔ دفتر کے منیجر کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کل کے ہوائی جہاز میں ہم تینوں کے لیے سیٹیں حاصل کرنے کے امکانات بہت کم ہیں۔

مکہ اور مدینہ سے رُخصت ہونے کے بعد مجھے ظہران میں ایک ہفتہ قیام کرنا انتہائی صبر آزما محسوس ہوتا تھا۔ اب ہمیں صرف یہ تسلی تھی کہ بحرین سے متعدد کمپنیوں کے طیارے کراچی کی طرف پرواز کرتے ہیں اور ہم یہاں ایک ہفتہ ٹھہرنے کی بجائے وہاں پہنچ کر قسمت آزمائی کر سکیں گے۔ ہمیں بعض حضرات نے جدہ میں اس امر کا احساس دلایا تھا کہ ظہران میں بعض اوقات اس قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہم نے ان کے مشورہ پر احتیاطاً ظہران کے ویزے حاصل کر لیے تھے۔

ظہران اور بحرین کے درمیان ہوائی سفر چند منٹوں میں ختم ہو جاتا ہے اور چھوٹے طیاروں کے علاوہ کشتیاں بھی چلتی ہیں۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ کل کے۔ ایل۔ ایم کے ہوائی جہاز پر قسمت آزمائی کر کے دیکھ لیں۔ اگر وہاں سیٹ نہ ملے تو بحرین روانہ ہو جائیں۔ چنانچہ ہم نے ٹیکسی پر ہوائی اڈے سے چند میل دُور الخبر کی آبادی کا رُخ کیا۔ وہاں راؤ اختر صاحب سے ملاقات ہوئی اور وہ ہمیں اپنے ہاں لے گئے۔ راؤ اختر صاحب کی بدولت کئی ایسے پاکستانیوں سے ملاقات ہوئی جو مجھے جانتے تھے۔ مجھے راؤ اختر صاحب کی مہمان نوازی کے تذکرہ کے لیے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔

اگلے دن ہم ہوائی جہاز کی آمد سے کافی دیر پہلے ہوائی اڈہ پر پہنچ گئے۔ راؤ اختر اور چند اور پاکستانی ہمیں رُخصت کرنے کے لیے کراچی آئے، لیکن "کے۔ ایل۔ ایم" کے دفتر پر مسافروں کا ہجوم دیکھ کر میں اور میرے وہ ساتھی بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہے تھے کہ جب ہوائی جہاز آئے گا تو ہم غالباً رُخصت ہونے والوں کی بجائے الوداع کہنے والوں کی قطار میں کھڑے ہوں گے۔ ایک نوجوان نے ہمارے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا یہ اتفاق کی بات ہے کہ کراچی کے اتنے مسافر یہاں جمع ہو گئے ہیں۔

یہ تمام حضرات ہماری طرح ٹورسٹ کلاس کے مُسافر تھے۔ دفتر سے استفسار پر ہمیں پتہ چلا کہ قاہرہ سے فرسٹ کلاس کی چند سیٹیں خالی آ رہی ہیں اور وہ زائد کرایہ ادا کرنے والوں کو مل سکتی ہیں۔ اپنی جیبیں تلاش کرنے کے بعد مجھے یہ اطمینان ہوا کہ میں زائد کرایہ ادا کر سکتا ہوں۔ یہ رقم میں نے اس خیال سے بچا رکھی تھی کہ شاید مجھے ظہران یا بحرین چند دن رُکنا پڑے۔

میں نے متعلقہ افسر سے کہا "میں زائد کرایہ دینے کے لیے تیار ہوں"
"ابھی ٹھہریے۔ ہوائی جہاز آئے گا تو آپ کا ٹکٹ تبدیل کر دیا جائے گا۔"

ایک صبر آزما انتظار کے بعد ہوائی جہاز آیا اور کے، ایل، ایم کے دفتر پر ہجوم کرنے والے مسافروں کو سیٹیں تقسیم ہونے لگیں۔ پہلے اُن کی باری آئی جنھوں نے ہم سے کئی دن قبل دفتر میں اپنے نام درج کروا رکھے تھے۔ بالآخر متعلقہ افسر نے میری طرف دیکھا اور کہا "لائیے اپنا ٹکٹ!" ——— میں نے ٹکٹ کے ساتھ سفری چیک بھی کاؤنٹر پر رکھ دیے۔ اُس نے مُسکرا کر کہا "آپ کو زائد کرایہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ ٹورسٹ کلاس میں

جاسکتے ہیں:

"میرے دو ساتھیوں کو بھی اسی ہوائی جہاز پر جگہ مل گئی اور تھوڑی دیر بعد میں "کے. ایل. ایم" کے طیارے کی کھڑکی سے اُس صحرا کی آخری جھلک دیکھ رہا تھا، جس کی وسعتوں میں عالمِ انسانیت کی تمام عظمتیں پوشیدہ ہیں، جس کی ایک بے آب و گیاہ وادی میں انوارِ الٰہی کی بارش ہوتی ہے"

عرب کا حال اور مستقبل

سعودی عرب میں میرا قیام بہت مختصر تھا اور میں اس کے موجودہ سیاسی اور معاشرتی حالات کے متعلق کچھ جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پھر وہاں میرے دل میں ایک سیاح کے تجسس سے زیادہ ایک زائر کی عقیدت اور محبت کے جذبات موجزن تھے۔ تاہم بعض ایسی باتیں ہیں جن کا ذکر کیے بغیر یہ سفرنامہ غیر مکمل معلوم ہوتا ہے۔ قارئین کے لیے یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ سعودی عرب کا معاشرہ لُوٹ مار، چوری اور دُوسرے اخلاقی جرائم سے بہت حد تک پاک ہے۔ بدامنی کے ادوار میں بدوی لوگ لُوٹ مار کے لیے مشہور تھے، لیکن ابنِ سعود کے عہدِ حکومت میں سختی کے ساتھ شرعی قوانین کے نفاذ کے بعد وہاں کے حالات یکسر بدل گئے ہیں۔ چور کے لیے ہاتھ کاٹ دینے کی سزا بظاہر بہت سخت معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں مغرب کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک کی پولیس اور عدالتیں اپنی مستعدی اور ہوشیاری کے باوجود اس جُرم کا سدِّباب نہیں کر سکیں اور یورپ اور امریکہ کے خوشحال ترین ممالک میں چوری اور لوٹ مار کی بے شمار وارداتیں ہوتی رہتی

ہیں، وہاں عرب میں شاذونادر ہی اس قسم کے واقعات رُونما ہوتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں جیلیں بعض مجرموں کے لیے تربیت گاہوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، بعض اوقات ایک معمولی چور سزا کاٹنے کے بعد ایک بڑا ڈاکو یا قاتل بن جاتا ہے، لیکن عرب میں ایک چور ہاتھ کٹوانے کے بعد لاکھوں انسانوں کے لیے نمونۂ عبرت ثابت ہوتا ہے اور اسے دیکھنے والے چوری کے تصور تک سے کانپ اُٹھتے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں چند چوروں اور قاتلوں کو جو سزائیں دی گئی تھیں اُن کے اثرات آج کئی سال بعد بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ان سزاؤں کا مقصد جرائم سے نفرت پیدا کرنا تھا اور آج عرب کے پسماندہ لوگ بھی چوری سے اس قدر نفرت کرتے ہیں کہ اگر آپ سڑک پر کوئی چیز پھینک دیں تو کوئی اسے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ وہاں مکانوں کو تالے لگانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

عوام صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ اذان سُنتے ہی سب کام چھوڑ کر مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ حکومت بھی اس بات کا خاص خیال رکھتی ہے کہ عوام اُس اخلاقی بے راہ روی سے محفوظ رہیں جو کسی معاشرے میں عُریانی، بے حیائی اور عورتوں اور مردوں کے آزادانہ میل جول سے پیدا ہوتی ہے۔ عورت کو ابھی تک وہاں شمعِ محفل کی بجائے چراغِ خانہ سمجھا جاتا ہے۔ سعودی عرب غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جہاں کوئی سینما یا تھیٹر نہیں۔ ظہران میں آئل کمپنی کے غیر ملکی ملازموں کی تفریح کے لیے ایک سینما ہے، لیکن مسلمانوں کو وہاں جانے کی ممانعت ہے۔ شراب نوشی پر سخت پابندی ہے اور حکومت اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ باہر سے شراب کا قطرہ بھی عرب کی حدود میں داخل

نہ ہو۔ عرب کی شہری سوسائٹی بھی اُن بُرائیوں سے بہت حد تک پاک ہے جو عوام کو ایک اسلامی معاشرے کی اخلاقی حدُود پھاندنے کی ترغیب دے سکتی ہیں۔

مگر اس خوشگوار تصویر کا ایک تکلیف دہ پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ سعودی عرب کے بعض امرا، آج بھی اپنے گھروں میں لونڈیاں اور غلام رکھتے ہیں اور یہ لوگ عام طور پر لبنان، مسقط اور عمان وغیرہ سے لاکر یہاں فروخت کیے جاتے ہیں۔ مجھے اس مسئلہ پر جن لوگوں سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا، وہ میرے اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکے کہ موجودہ دَور میں غلام یا لونڈی کی خرید و فروخت کہاں تک جائز ہے؟ مجھے صرف یہ بتایا گیا کہ ہمسایہ علاقوں کے تاجر کسی نہ کسی بہانے بعض افراد کو یہاں لے آتے ہیں اور ان کی زبان سے یہ اعلان کروایا جاتا ہے کہ وہ غلام ہیں اور سعودی عرب کے خریدار اُن کا سودا جائز قرار دینے کے لیے اس اعلان کو کافی سمجھ لیتے ہیں اور اس قسم کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کہ یہ لوگ غلام کیسے بن گئے یا انھیں کن حالات میں یہاں لایا جاتا ہے؟

یہ ہو سکتا ہے کہ غلاموں کا کاروبار کرنے والے تاجر بعض لوگوں کو چھوٹی عمر میں اغوا کر کے یہاں پہنچا دیتے ہوں یا بعض لوگ اپنی اقتصادی بدحالی سے تنگ آ کر ان تاجروں کے ساتھ اپنی آزادی کا سودا چکا لیتے ہوں۔ بہر حال یہ ایک ایسی بردہ فروشی ہے جسے کسی حالت میں جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سعودی عرب کے امرا کے ہاتھ ان لوگوں کے برضا و رغبت فروخت ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں دولت کی فراوانی ہے اور یہ لوگ ان کے غلام بننے کے باوجود اپنے علاقوں کے نجی ملازموں سے زیادہ فراغت

کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

ایک رات میں مدینہ منورہ کے ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا کہ ایک انتہائی خوش پوش نوجوان آیا اور میرے قریب کافی پینے بیٹھ گیا۔ اس کے لباس اور اطوار سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی امیر گھرانے کا چشم و چراغ ہے، لیکن جب وہ تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر چلا گیا تو ہوٹل کے مالک نے مجھے بتایا کہ وہ مدینہ کے گورنر کا غلام ہے۔ میں نے کہا "وہ تو خود گورنر معلوم ہوتا تھا۔" اس کے بعد چند اور آدمیوں کے ساتھ بھی غلامی کے مسئلے پر گفتگو ہوئی اور مجھے معلوم ہوا کہ اہلِ عرب پر اسلامی روایات کا اتنا اثر ضرور ہے کہ وہ اپنے غلاموں کے ساتھ انتہائی فیاضی سے پیش آتے ہیں۔ وہ جو کھانا خود کھاتے ہیں، وہی غلاموں کو کھلاتے ہیں اور جو لباس خود پہنتے ہیں، وہی انھیں پہناتے ہیں۔ یہاں آقا کی خوش حالی کا اندازہ اُس کے غلام کے چہرے سے لگایا جاتا ہے۔ عام عربوں کی نسبت ان غلاموں کی حالت کہیں بہتر ہے۔ مالک کام لینے سے زیادہ ان کی نازبرداری کرتے ہیں۔

جدّہ میں ایک انتہائی روشن خیال آدمی سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب ریاض کے امراء کے خانگی حالات سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور انھوں نے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا "سعودی عرب میں غُلام اور لونڈیاں رکھنے والے امراء کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے اور میں اس بردہ فروشی کو انتہائی معیوب سمجھتا ہوں۔ تاہم یہ لوگ اپنی حالت پر اس قدر قانع ہیں کہ اُن میں شاید ہی کوئی ایسا ہو، جو واپس اپنے وطن جانا پسند کرتا ہو۔"

ان صاحب کی باتیں سُننے کے بعد میرا اندازہ تھا کہ اگر ان غلاموں اور لونڈیوں کو زبردستی عرب کی حدُود سے باہر نکال دیا جائے، تو بھی وہ اپنے

آقاؤں کے پاس واپس بھاگ آئیں گے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ لوگ غلام کہلاتے ہیں اور سعُودی حکومت ان کی خرید و فروخت کو جائز قرار دینے کے لیے کوئی معقول عذر پیش نہیں کر سکتی۔ کاش سعودی علماء جنھیں دین کے ہر مسئلہ میں حکوُمت کے رہنما ہونے کا دعوٰی ہے، اس بدعت کی طرف توجہ دے سکیں۔ غلام بنانے کے لیے کسی کا دولت مند ہونا یا غلام بننے کے لیے کسی کا بے بس اور حاجتمند ہونا کافی نہیں۔

ایک سیاح پڑوس کے اسلامی ممالک دیکھنے کے بعد جب عرب میں داخل ہوتا ہے تو اُسے یہ محسُوس ہوتا ہے کہ یہاں وقت کی رفتار ڈھیلی پڑ گئی ہے اور عوام بہت حد تک بیسویں صدی کے اس مدوجزر سے محفُوظ ہیں، جس نے ہمسایہ ممالک کے عوام کو ایک ذہنی اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ لوگ ایٹمی دَور کے برق رفتار قافلوں سے منزلوں پیچھے نظر آتے ہیں۔ تاہم اپنے بدوی خصائل کے باعث وہ اس احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوئے، جس کے باعث مشرق کی پسماندہ اقوام مغرب کی نقال بن کر رہ گئی ہیں، وہ آج بھی اپنی زبان، اپنے لباس اور اپنے کلچر پر فخر کرتے ہیں۔

عرب اپنے مادّی وسائل کے اعتبار سے ہمیشہ ایک غریب ملک تھا اور یہی وجہ تھی کہ اہلِ عرب عیش و آرام کی زندگی کے دلدادہ نہ تھے۔ وسائلِ حیات کی کمیابی انھیں بیدار اور متحرک رکھتی تھی اور زندہ رہنے کے لیے ایک نہ ختم ہونے والی جدّوجُہد کے دوران انھیں ہمیشہ اپنے بدویانہ خصائل کا سہارا لینا پڑتا تھا لیکن اب صحرائے عرب کے یہ جفاکش اور غریب باشندے ایک نئی صورتِ حال کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ جب تک بکریاں اور اُونٹ چرا کر

اپنی روزی حاصل کرنے کا مسئلہ تھا، وہاں ادنیٰ اور اعلیٰ امرا وغریب کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہ تھی، راعی اور رعیت کے درمیان کوئی ناقابلِ عبور خلیج حائل نہ تھی، لیکن اب عرب میں بڑی تیزی کے ساتھ ایک معاشی انقلاب آرہا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اس انقلاب سے صحیح فوائد حاصل کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو اس بدوی سوسائٹی کی بنیادیں خطرے میں پڑ جائیں گی، جسے صدیوں کے بیرونی انقلابات متاثر نہیں کرسکے۔

بے آب وگیاہ صحرا کی وسعتیں صدیوں سے عربوں کی تہذیب وروایات کی حفاظت کررہی ہیں، لیکن اب اس صحرا کے سینے سے معدنی تیل کے چشمے ابل پڑے ہیں اور اس بے حساب دولت نے چند سال کے اندر اندر عرب کے حکمران طبقے کو اونٹ سے اتار کر ہوائی جہاز پر سوار کردیا ہے۔ اس دولت کے طفیل بادیہ نشینوں کے حکمران اپنے لیے عرب کے شہروں میں عظیم الشان محل تعمیر کررہے ہیں، جو شاید بغداد اور دمشق کے پرشکوہ خلفاء کو بھی نصیب نہیں ہوئے تھے۔ حاکم اور رعایا کی اقتصادی حالت کے درمیان جو بُعد آج دیکھنے میں آتا ہے، وہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ایک رفاہی مملکت میں یہ دولت پوری قوم کی اقتصادی کایا پلٹ کرسکتی تھی، لیکن عرب میں ایک شخصی حکومت ہے اور وہاں قوم سے کہیں زیادہ شاہی خاندان کو اس دولت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ وہاں اس دولت سے کارخانے قائم نہیں ہورہے، بنجر زمینوں کو سیراب کرنے کے منصوبے تیار نہیں ہوتے، وہ عظیم علمی اور فنی درسگاہیں تعمیر نہیں ہوتیں، جہاں سے پچھڑی قوموں کے معمار بن کر نکلتے ہیں، بلکہ اس دولت کا بیشتر حصہ حکمران خاندان کے شہزادوں کے لیے زندگی کی آسائشیں مہیا کرنے پر صرف ہوتا ہے۔

آج دنیا بھر میں سعودی عرب کا اعلیٰ طبقہ یورپ اور امریکہ سے دستیاب ہونے والے سامانِ تعیش کا سب سے بڑا خریدار ہے۔ جدید ترین ماڈل کی قیمتی کاریں امریکی کروڑ پتیوں سے پہلے سعودی شہزادوں کے پاس پہنچ جاتی ہیں اور فیکٹریوں میں نئے ڈیزائن ابھی تیار نہیں ہوتے کہ انھیں سعودی عرب کے امراء کا اڈوانس آرڈر موصول ہوجاتا ہے۔ ایرکنڈیشنڈ محلات کی آرائش و زیبائش کے سازوسامان کی خریداری میں بھی اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ جو مصنوعات دولت سے خریدی جاسکیں، ان کے حصول میں تاخیر نہ ہو۔ بیرونی منڈیوں میں کسی شے کا نایاب اور بیش قیمت ہونا ہی عرب کے شہزادوں کا شوقِ خریداری بیدار کرنے کے لیے کافی ہے۔ جب وہ یورپ اور امریکہ کی سیر کے لیے نکلتے ہیں تو ان کا اولین مقصد اپنی دولت کی نمائش ہوتا ہے اور ان کی فضول خرچیاں دیکھ کر فورڈ اور راک فیلر کے جانشین بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔

دولت بذاتِ خود بری چیز نہیں، لیکن اگر اس کا مصرف صحیح نہ ہو تو اس سے برے نتائج پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ تیل کی دولت سے عرب کے حکمران طبقے کی جو ذہنی کایا پلٹ ہوئی ہے، اس سے عرب معاشرے کے لیے کسی اچھے نتائج کی توقع کرنا ایک خودفریبی ہوگی۔ عرب کا اعلیٰ طبقہ دولت کے تیز رفتار گھوڑے پر سوار عوام سے دور ہوتا جارہا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ لوگ عوام کو اپنی تہذیب واخلاق کے دائرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتے، لیکن آج وہاں ایک معمولی ذہانت کا آدمی بھی یہ سوچتا ہے کہ جو بات عوام کے لیے غلط ہے، وہ حکمرانوں کے لیے کیونکر درست ہوسکتی ہے۔ عوام وہاں سینما نہیں دیکھ سکتے اور ان کا ماحول ایسا ہے کہ وہ اپنے شہروں

میں سینما گھروں کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے، لیکن وہ اس بات کو ضرور محسوس کرتے ہیں کہ اُن کی تہذیبی اور اخلاقی قدروں کے بعض نگہبان اپنے گھروں کے اندر بیٹھ کر تازہ ترین فلمیں دیکھ لیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے انھوں نے پرائیویٹ پروجیکٹر لگا رکھے ہیں۔

عوام ہمیشہ اپنے حکمرانوں کی نقل کرتے ہیں اور عرب عوام کا جلد یا بدیر اپنے حکمرانوں سے متاثر ہونا ایک قدرتی بات ہوگی۔ یہ درست ہے کہ شاہی خاندان کی دوسری نسل کے اکابر عوام کے سامنے شرعی حدود کا احترام کرتے ہیں اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے دینی عقاید کے معاملہ میں کافی شدید ہیں، لیکن بدقسمتی سے اعلیٰ طبقہ کی نئی پود کی تعلیم و تربیت عرب سے باہر ہو رہی ہے۔ جو نونہال آج کل بیروت میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ان کے دل اور دماغ ایک نئے سانچے میں ڈھل رہے ہیں اور جب یہ بڑے ہو کر ملک کی زمامِ کار سنبھالیں گے تو مغربی تہذیب و اخلاق کے تمام زہریلے اثرات وہاں پہنچ جائیں گے۔ اگر عوام نے اُن کی تقلید کی تو وہ مغرب کے ادنیٰ نقال بن کر رہ جائیں گے اور اگر عوام نے اپنا راستہ بدلنا پسند نہ کیا تو حکومت اور اُن کے درمیان ایک ایسا خلا پیدا ہو جائے گا، جسے ہمیشہ انقلابی قوتیں پُر کرتی ہیں۔ مجھے کوشش کے باوجود یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مغرب کے تعلیمی اداروں میں عرب کے جن نونہالوں نے تعلیم حاصل کی ہے، اُن میں سے کتنے ہیں جو نامور ڈاکٹر، انجینیئر، سائنس دان اور دوسرے علوم و فنون کے ماہر بن کر واپس آئے ہیں اور ملک کی تعمیر میں اُنھوں نے کیا حصہ لیا ہے۔ میں صرف یہ معلوم کر سکا ہوں کہ اپنے بڑوں کی طرح ان صاحبزادوں کو بھی بیرونی ممالک میں تیل کی دولت لٹانے سے زیادہ

کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔

یہ عرب کی بدقسمتی ہے کہ وہاں کی حکومت بے حد و حساب دولت کی مالک ہونے کے باوجود ایسے ادارے قائم نہیں کر سکی جہاں قوم کے بچے اپنی قومی خصوصیات برقرار رکھتے ہوئے تعلیم حاصل کر سکیں۔

مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، ریاض اور ظہران کے بازاروں میں معدنی تیل سے حاصل ہونے والی دولت کے اثرات عام دیکھے جا سکتے ہیں۔ بیرونی زرِ مبادلہ کی فراوانی کے باعث ان شہروں میں خوشحال تاجروں کا ایک طبقہ پیدا ہو رہا ہے۔ تاہم ان شہروں کی قلیل آبادی کی خوشحالی پورے ملک کی خوشحالی سمجھنا غلطی ہوگی۔ بدوی قبائل ابھی تک اس دولت کی نعمتوں سے محروم ہیں اور سعودی حکمران اپنی روایتی فیاضی کے باوجود ان کی معاشی حالت بہتر نہیں بنا سکے۔ یہ درست ہے کہ وفادار قبائل کے شیوخ یا دوسرے بااثر لوگوں کو حکومت کا وفادار رکھنے کے لیے کافی مراعات دی جاتی ہیں، لیکن چند افراد کو انعام و اکرام یا وظائف دے کر خوش رکھنے سے عامۃ الناس کی معاشی حالت میں کوئی انقلاب نہیں آ سکتا۔

انسانی تاریخ کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ آج جب کہ بین الاقوامی حالات نے ہر قوم کے سینے میں زندگی کا ایک اجتماعی شعور اور ولولہ پیدا کر دیا ہے، وہ ملت جس نے سب سے پہلے دُنیا کے سامنے ایک رفاہی ریاست کا مثالی نمونہ پیش کیا تھا، جس کے امیر کھجور کی چٹائی پر بیٹھ کر مشرق و مغرب کے کجکلاہوں کو فرمان لکھا کرتے تھے اور جَو کی روٹی کا نوالہ اُٹھانے سے پہلے یہ تسلی کر لیا کرتے تھے کہ اُن کی رعایا کا کوئی فرد بھوکا تو نہیں رہا، دو طبقوں میں بٹ چکی ہے۔ آج ایک رفاہی ریاست کا مثالی نمونہ پیش کرنے

والی قوم کے امیر و غریب طبقوں کے درمیان تیل کا دریا حائل ہو چکا ہے۔ اس دریا کے ایک کنارے سے کشادہ سڑکیں اور عالی شان محل دکھائی دیتے ہیں اور دوسرے کنارے سے اُن لوگوں کے جھونپڑے دکھائی دیتے ہیں، جو آج بھی صحرا کے بے نشان راستوں پر سفر کرتے ہیں۔

تیل کی جتنی آمدنی شاہی خاندان کے افراد کے لیے زندگی کی آسائش مہیا کرنے پر صرف ہوتی ہے، اس کا عشرِ عشیر بھی رفاہِ عامہ پر خرچ نہیں ہوتا۔ تیرہ صدیاں قبل عرب کا ایک غریب بدو بھری محفل میں فاروقِ اعظمؓ سے مالِ غنیمت کی چادروں کی تقسیم کے بارے میں سوال پوچھنے کی جرأت کر سکتا تھا، لیکن آج عرب کے بڑے بڑے شیوخ اور علماء بھی اپنے حکمرانوں سے یہ استفسار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ عرب کی زمین جو خزانے اگل رہی ہے، وہ کہاں جا رہے ہیں؟ علماء حضرات صرف اس بات پر ہی پھولے نہیں سماتے کہ حکومت نے ان کے مطالبات پر بزرگانِ دین کی قبریں مسمار کر دی ہیں اور حکومت کے سپاہی اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ لوگ گنبدِ خضرا کی جالی کو ہاتھ نہ لگا سکیں۔ ان معاملات میں سعودی علماء کی انتہا پسندی کا یہ عالم ہے کہ حدیبیہ کے مقام پر جس چھوٹی سی مسجد کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ حال ہی میں شہید کر دی گئی ہے اور حکومت کے اس افسوس ناک اقدام کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ باہر سے آنے والے لوگ اس مقدس مقام کے ساتھ جس عقیدت اور محبت کا اظہار کرتے تھے، اُس سے اِن حضرات کے جذبات مجروح ہوتے تھے۔ حجاز میں بے شمار ایسے مقامات ہیں، جن کے ساتھ اسلام کے ماضی کی ناقابلِ فراموش یادیں وابستہ ہیں اور جنھیں دیکھ کر ایک مسلمان اپنی روح میں ایک تازگی محسوس کرتا ہے، لیکن

سعودی علماء کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ لوگ وہاں نہ جائیں۔ یہاں تک کہ مقامی لوگ کسی کو غارِ حرا یا غارِ ثور جیسے مقامات کا راستہ بتانے سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ممالک جن بیرونی خطرات کا سامنا کر رہے ہیں، سعودی عرب اُن سے آزاد نہیں۔ اسرائیلی ریاست عرب ممالک کے وجود میں ایک رِستے ہوئے ناسور کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ عرب جمہوریہ عراق اور شرقِ اُردن کے عوام صیہونیت کے خطرے سے پوری طرح باخبر ہیں اور وہاں کی حکومتیں بھی اپنے اختلافات کے باوجود یہ محسوس کرتی ہیں کہ صیہونی جارحیت سے اُن کے تحفظ کی واحد ضمانت اُن کی فوجی قوت ہے، لیکن سعودی عرب دفاعی لحاظ سے جتنا کمزور آج ہے، اتنا کمزور شاید پہلے کبھی نہ تھا۔ وہاں فوج نہ ہونے کے برابر ہے۔

حکمران طبقے نے گزشتہ چند برس میں جو دولت خوب صورت کاروں اور ذاتی ضرورت کے سُنہری طیاروں اور آسائش کے دوسرے سازو سامان کی خریداری پر صرف کی ہے، اگر وہ ملک کے دفاع پر خرچ کی جاتی، تو آج سعودی عرب کے پاس مشرقِ وسطیٰ کی مضبوط ترین فوج ہوتی۔ سعودی عرب کے بدوی قبائل انتہائی جنگ جو اور بہادر ہیں اور حکومت کے پاس انھیں بہترین اسلحہ مہیا کرنے کے لیے روپے کی کمی نہ تھی، لیکن وہاں ملک کی دفاعی ضرورت سے زیادہ اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ حکمران خاندان کو اپنی حفاظت کے لیے کتنے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ چند برس قبل عرب کو ایک بڑی تعداد میں مستقل فوج کی ضرورت نہ تھی اور حکومت صرف بدوی قبائل کے تعاون سے معمولی قسم کے بیرونی خطرات کا مقابلہ کر سکتی تھی،

لیکن جب سے مغرب کی سامراجی طاقتوں نے ممالکِ عرب کی شہ رگ پر صیہونیت کا خنجر رکھ دیا ہے، مشرقِ وسطےٰ کا کوئی ملک ایک مستعد فوج کے بغیر اطمینان کا سانس نہیں لے سکتا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اسرائیلی ریاست اپنے محدود اقتصادی وسائل کے باوجود اپنی فوجی قوت کے لحاظ سے مشرقِ وسطےٰ کے ہر ملک سے زیادہ مضبوط ہے۔ یہودیوں کے پاس سعودی عرب کی طرح معدنی تیل کے ذخیرے نہیں۔ وہ باہر سے خام تیل حاصل کرتے ہیں اور اسے صاف کر کے اپنی ضرورت پوری کرنے کے علاوہ باہر بھیج کر روپیہ کماتے اور جدید ترین اسلحہ خریدتے ہیں۔ انھوں نے چند برس کے اندر اندر فلسطین میں جس مضبوطی سے قدم جمائے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں جو ترقی کی ہے وہ اہلِ عرب ممالک کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے، لیکن سعودی عرب کو ابھی تک یہودیوں کے جارحانہ عزائم کا پورا احساس نہیں ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ سعودی عرب کی موجودہ حکومت فوج کی حالت بہتر بنانے کی فکر میں ہے، لیکن یہ نیم دلانہ کوششیں اس یہودی ریاست کا جواب نہیں ہو سکتیں جس کے تمام زن و مرد جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کیے جا رہے ہیں۔

میں اپنی محدود معلومات کے باوجود سعودی عرب سے یہ تأثر لے کر آیا ہوں کہ وہاں کے عوام دیر تک اپنی حالت پر قانع نہیں رہ سکتے۔ چند افراد کی خوش حالی یا فراغت کسی قوم کے لیے زندگی کے اجتماعی ولولے کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔

سعودی عرب کے باشندے بین الاقوامی سیاست کے اُس مدوجزر سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے، جس نے دوسرے عرب ممالک کے عوام کو ایک اضطراری اور سیمابی کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اہلِ عرب جب

اپنے ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو اُن کی نگاہیں اپنے اُن بزرگوں کے پاؤں کے نقوش پر رُک جاتی ہیں، جو تیرہ صدیاں قبل زندگی کے ہر میدان میں اقوامِ عالم کے مشعل بردار تھے۔ یہ ماضی ان کے سامنے ایک ایسے خوش حال معاشرے کی تصویر پیش کرتا ہے، جس میں غریب اور امیر، ادنیٰ اور اعلیٰ یا راعی اور رعیّت کے درمیان مرمریں دیواریں حائل نہ تھیں۔ یہ ماضی انھیں ان خلفاء کی یاد دلاتا ہے، جو روم اور ایران جیسی پُرشکوہ سلطنتوں کا تختہ اُلٹنے کے باوجود اپنے لباس کو پیوند لگایا کرتے تھے۔ عمر فاروقؓ کا زمانہ عربوں کی دُنیاوی ترقی، خوش حالی، ذہنی آسودگی اور رُوحانی سکون کا سنہری زمانہ تھا اور آج عربوں کے سینے میں زندگی کا ایک اجتماعی ولولہ بیدار کرنے کے لیے اسی دَور کی حسین روایات کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اپنی تعلیمی اور سیاسی پسماندگی اور معاشرے کی اقتصادی ناہمواری کے باوجود عرب ایک زندہ قوم ہیں اور ایک زندہ قوم ایک غیر معین عرصہ تک جامد و ساکت نہیں رہ سکتی۔ جس قافلے کے راہنما اُسے صحیح راستہ نہ دکھا سکیں، وہ بسا اوقات اضطراب کی حالت میں غلط راستہ بھی اختیار کر لیتا ہے۔ عربوں کے لیے یہ کافی نہیں کہ تیل کی دولت سے ریاض اور دوسرے شہروں میں اُن کے لیے عالی شان محل تعمیر ہو رہے ہیں، یا اُن کے لیے بہترین کاریں اور عیش و آرام کی دوسری چیزیں خریدی جا رہی ہیں، یا لبنان اور دوسرے مغربی شہروں کے عشرت کدے ان کے دم سے آباد ہیں۔

اگر چند متموّل گھرانوں کے نوجوان یورپ کی بعض زبانوں میں معمولی دسترس پیدا کر کے یا مغربی تہذیب و اخلاق کے نقّال بن کر ایک پسماندہ ملک کو ترقی کی راہ پر ڈال سکتے ہیں تو سعودی عرب کا طبقۂ اعلیٰ بلاشبہ اس میدان

میں اپنی سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کے لیے کوشاں ہے۔

مغربی ممالک میں سعودی عرب کے طلبا نے اسکولوں سے زیادہ نائٹ کلبوں میں نام پیدا کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نونہال صرف بیروت کی نائٹ کلبوں میں جتنا روپیہ ضائع کرتے ہیں، وہ شاید سعودی عرب کے پورے تعلیمی بجٹ سے بھی زیادہ ہو۔

عرب نے اپنی انتہائی مفلسی یا سیاسی بدحالی کے ایام میں بھی کسی بیرونی تہذیب کے مضر اثرات قبول نہیں کیے تھے، لیکن آج تیل کی دولت نے ان پر مغربی تہذیب کے اس خطرناک سیلاب کے دروازے کھول دیے ہیں، جو بدوی سوسائٹی کی تمام اخلاقی اور روحانی بنیادوں کو تہ و بالا کر رہا ہے۔

افراد کی طرح اقوام کو بھی زندہ رہنے کے لیے کسی منزلِ مقصود یا نصب العین کی ضرورت ہوتی ہے، کسی ایسے نصب العین کی ضرورت، جس کے حصول کے لیے عوام اپنی تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں بروئے کار لا سکیں۔

سیاسی نظریات کی کش مکش کے اس دور میں عرب عوام جب اپنے منفی خلا سے باہر جھانکتے ہیں تو سب سے پہلے ان کی توجہ عرب نیشنلزم کی تحریک کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ انھیں اپنی جامد اور ساکت زندگی سے ایک اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنے مصری اور شامی بھائیوں کے اضطراب میں حصہ دار بننا چاہتے ہیں۔ جمال عبدالناصر انھیں ایک ہمسایہ ریاست کا حکمران نہیں بلکہ اقوامِ عرب کا ایک نقیب دکھائی دیتا ہے۔ انھیں اس بات سے غرض نہیں کہ جمال عبدالناصر اپنے ساتھ جو قافلہ لے کر نکلا ہے، اُس کی

آخری منزل کیا ہے یا اُس کے عزائم کس حد تک اسلام کی حدود کے اندر ہیں؟ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ جمال عبدالناصر ملتِ عرب کے دشمنوں کا دشمن ہے۔ اس نے صیہونیت کے ساتھ ٹکر لی ہے۔ اُس نے مغرب کی اُن سامراجی طاقتوں کے دانت کھٹے کیے ہیں جن کی چیرہ دستیوں کے باعث فلسطین تقسیم ہوا تھا اور دس لاکھ عرب اپنے گھروں سے نکال دیے گئے تھے۔ وہ عرب جمہوریہ کے اقتصادی وسائل کو اپنے عیش و آرام پر صرف نہیں کرتا اور ملک کی آمدنی کی ایک ایک کوڑی اس کی دفاعی اور تعمیری ضروریات پر صرف کرتا ہے۔ اس لیے وہ اُسے اپنا ہیرو خیال کرتے ہیں۔

سعودی عرب کے عوام کے ذہنی خلا میں عرب قومیت کی تحریک کو جگہ مل رہی ہے۔ وہ جمال عبدالناصر کے نعروں سے متاثر ہو رہے ہیں، کیونکہ ان کے حکمران انھیں کوئی ایسا نعرہ نہیں دے سکتے، جو اُن کا خون گرما سکتا ہو ـــــ قاہرہ اور دمشق کے اخبارات اور صوت العرب کی نشریات بڑی تیزی سے اُن کی ذہنی کایا پلٹ رہی ہیں۔

آج سے چند برس قبل اخوان المسلمون نے اسلام کے احیا کے حق میں جو ولولہ بیدار کیا تھا، وہ عرب نیشنلزم کے ہنگاموں میں دب چکا ہے اور یہ عالمِ اسلام کی بدقسمتی ہے کہ موجودہ دور میں، جب کہ سیاسی اور اقتصادی حالات نے اقوامِ یورپ کو نسلی اور لسانی قومیت کے محدود دائروں سے نکل کر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور اشتراک پر مجبور کر دیا ہے، ممالکِ عرب ایک ایسی تحریک سے متاثر ہو رہے ہیں جو اسلام کی عالم گیر اخوت کے تصور کے منافی ہے اور اُن عرب اور غیر عرب مسلمانوں کے درمیان اجنبیت کی دیواریں کھڑی کر سکتی ہے جو صدیوں سے کسی سیاسی مصلحت یا

اقتصادی مجبوری کے بغیر ایک ملّت کے وجود کے اعضا سمجھے جاتے ہیں، لیکن عرب نیشنلزم کے حامیوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے ہم ارضِ پاک کے اُن پاسبانوں کی کوتاہی اور غفلت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے، جو دینِ اسلام کی حیات بخش قوتوں کو اپنے عوام کی ڈھال اور تلوار بنانے سے قاصر رہے ہیں۔ اگر عرب قومیّت کے تصور نے بین الاسلامی اتحاد کی جگہ لے لی تو یہ اسلام کی شکست نہیں ہوگی، بلکہ یہ عرب ممالک کے ان راہنماؤں کی شکست ہوگی جو اپنے عوام کے سامنے اسلامی سیرت و کردار کا نمونہ پیش نہیں کر سکے اور اُن قافلوں کو صراطِ مستقیم نہیں دکھا سکے، جنھیں موجودہ دَور کے سیاسی مدوجزر نے بے چین و مضطرب کر رکھا ہے۔ آج جب کہ دنیا کی ہر قوم تاروں پر کمندیں ڈالنے کے لیے بے چین نظر آتی ہے، سعودی عرب کے عوام کے لیے یہ کافی نہیں کہ حکمران خاندان کے چند افراد نے اپنی کاریں دوڑانے کے لیے دو تین کشادہ سڑکیں تعمیر کر لی ہیں۔

اُن کی رُوح کی تسکین ہمسایہ اقوام کی مادی ترقّی کا جواب ہو سکتی تھی، لیکن ایسی رُوحانی تسکین کے سامان صرف ایسے حکمران مہیا کر سکتے ہیں، جن کی زندگی کا ہر سانس ملّت کے درد سے لبریز ہو، جو عوام کے سامنے دُنیا کی نعمتوں کے انبار لگا دیں اور خود جَو کی سُوکھی روٹی کا نوالہ اُٹھاتے ہوئے بھی اس تصور سے کانپ اُٹھیں کہ شاید آج میری رعایا کا کوئی فرد ایسا بھی ہو، جسے پیٹ بھر کر کھانا نہ ملا ہو۔

سعودی عرب کے عوام میں مَیں نے کوئی ایسا ولولہ نہیں دیکھا، جو عرب قومیّت کی تحریک کے ہنگاموں کا جواب ہو سکے، لیکن سرِدست یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ عرب قومیّت کی تحریک کا رُخ لازماً اسلام کے خلاف

ہوگا۔ عرب اگر چاہیں تو اپنے قومی اتحاد کے باوجود اسلام کے ساتھ ایسے رُوحانی رشتوں کو پہلے سے زیادہ مضبوط بنا سکتے ہیں۔ عراق کے واقعات اور اشتراکی عناصر کی چیرہ دستیوں نے اس تحریک کے رہنماؤں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ رُوحانی عقیدے کے بغیر اُن کا نسلی اتحاد ممالکِ عرب کے مسائل حل نہیں کر سکتا۔

چنانچہ اخوان کے متعلق جمال عبدالناصر کی پالیسی میں ایک خوشگوار تبدیلی آ رہی ہے اور صوت العرب سے اسلام کے حق میں بھی پُرجوش نعرے سُنائی دیتے ہیں۔ اگر یہ خوشگوار تبدیلی ہنگامی مصلحتوں کا نتیجہ نہیں، تو بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر اس تحریک کا سارا رُخ بدل جائے۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران یورپ کے انقلاب نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نسلی قومیّت کی تحریک کسی ملک کے عوام میں ایک عارضی مدّت کے لیے جذباتی ہیجان تو پیدا کر سکتی ہے، لیکن کسی نظریۂ حیات کی جگہ نہیں لے سکتی۔ موجودہ حالات نے اقوامِ عالم کو نسلی اور علاقائی قومیتوں کے محدود دائروں سے باہر نکل کر مختلف اور متصادم نظریاتی دھڑوں یا بلاکوں سے منسلک ہونے پر مجبور کر دیا ہے اور عربوں کی سب سے بڑی قوت وہ نظریۂ حیات ہے، جس نے دُنیا کے کروڑوں مسلمانوں کو بلاامتیازِ رنگ و نسل اُن کے ساتھ ایک ذہنی اور رُوحانی رشتے میں منسلک کر رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عرب قومیّت کے علمبردار بھی اس رشتے کی اہمیت سے بے خبر نہیں ہو سکتے، جس کی تجدید سے نہ صرف عرب ممالک کے سیاسی اختلافات دُور ہو سکتے ہیں، بلکہ عرب اور غیر عرب مسلمانوں کے درمیان بھی اجنبیت کی کوئی دیوار باقی نہیں رہتی۔

عرب قومیت کے سیلاب کی تند و تیز لہریں عراق، شرقِ اُردن اور تیونس میں جمال عبدالناصر کے سیاسی حریفوں کو مرعوب نہیں کر سکیں، لیکن قاہرہ سے اسلام کے جو مبلغ افریقہ بھیجے گئے ہیں، انھوں نے ایک قلیل عرصہ میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کی ہیں، یہاں تک کہ یورپ اور امریکہ کے مشن جو گزشتہ صدی سے اپنے لامحدود اقتصادی وسائل کے بل بوتے پر افریقہ میں عیسائیت کے جھنڈے گاڑنے کے لیے کوشاں تھے، یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ وہاں اسلام کا مستقبل عیسائیت کی نسبت کہیں زیادہ درخشاں ہے۔ ایک مختصر سے عرصہ میں افریقہ کے لاکھوں باشندے اسلام قبول کر چکے ہیں۔

اگر عرب جمہوریہ کے رہنما کا منتہائے نظر اپنے سیاسی اثر و رسوخ کو وسیع کر کے بین الاقوامی سیاست میں کوئی اہم مقام حاصل کرنا ہو تو بھی اسلام ہی وہ ضابطۂ حیات ہے جو ایک طرف عرب ممالک کے درمیان کسی پائیدار اتحاد کی بنیادیں فراہم کرتا ہے اور دوسری طرف ایک ایسے بین الاقوامی بلاک کی تشکیل کا ذریعہ بن سکتا ہے، جو بلا امتیاز رنگ و نسل افریقہ اور ایشیا کے ہر مسلمان کے لیے یکساں خیر و برکت کا باعث ہو ـــــ اسلام کی کوئی تعلیم عربوں کے اتحاد کے منافی نہیں، بلکہ اس کی بدولت عرب اور غیر عرب مسلمان ایک صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں، لیکن نیشنلزم کا نقطۂ آغاز ہی بین الاقوامی اتحاد کی نفی کرتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ دو تحریکیں مشرقِ وسطیٰ میں زیادہ عرصہ تک ایک ساتھ نہیں چلیں گی۔ اسلام یا عرب نیشنلزم میں سے کسی ایک کو دوسرے کے لیے جگہ خالی کرنی پڑے گی اور میرا قیاس یہی ہے کہ ذہنی اضطراب کے ایک

مختصر سے دور سے گزرنے کے بعد جب عرب ممالک اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں گے تو انھیں دینِ فطرت کے سوا سلامتی کا کوئی اور راستہ دکھائی نہیں دے گا۔

جہاں تک سعودی عرب کے عوام کا تعلق ہے، مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ابھی تک ریاض میں اُن کے اہنما انھیں زندگی کی تڑپ اور ولولے عطا کرنے سے قاصر ہیں اور اپنے مستقبل کے راستے تلاش کرنے کے لیے اُن کی نگاہیں قاہرہ اور دمشق پر لگی ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ قاہرہ اور دمشق کے راہنماؤں کو صحیح راستہ پہچاننے کی توفیق دے۔ (آمین)